پریم ناتھ پردیسی: عکس درعکس



ڈاکٹر محمد افضل میر

پریم ناتھ پردیسی

(عکس در عکس)

پریم ناتھ پردیسی

(عکس در عکس)

ڈاکٹر محمد افضل میر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

PREM NATH PARDESI
AKS DAR AKS

by

Dr. Muhammad Afzal Mir

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86624-30-7
Price Rs. 450/-

نام کتاب : پریم ناتھ پردیسی: عکس در عکس
نوعیت : تحقیق
مصنف وناشر : ڈاکٹر محمد افضل میر
اشاعت : ۲۰۱۷ء
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۴۵۰ روپے
سیٹنگ : سالک جمیل براڑ
9256033695
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

کتاب ملنے کا پتا:

Dr.Mohammad Afzal Mir
R/O : Ariphanthan,
Post Office: Magam, Berwah ,Kashmir
Pin Code: 193401
e-mail:mirafzal47@gmail.com
PhoneNumber:09596314000

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب۔۔۔۔۔۔

اپنے

والدین کے نام

جنہوں نے مجھے ہمیشہ

خوب سے خوب تر کی جستجو کی ترغیب دی

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

قدم قدم بڑھیں گے ہم، محاذ پر لڑیں گے ہم

یہ اس انقلابی گیت کا مکھڑا ہے جو تقسیم ہندستان کے بعد کشمیر کی وادی میں ہر سو گونجتا رہا جب ریاست جموں وکشمیر پر قبائیلوں نے حملہ کیا۔ اس شاہکار کے خالق کوئی اور نہیں بلکہ آزادی کے متوالے اور محبِّ وطن پریم ناتھ پردیسی تھے۔ پردیسی بیک وقت شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، ڈرامہ نگار بھی تھے اور ناول نگار بھی، صحافی بھی تھے اور رپورتاژ نگار بھی، لیکن ان کی شہرت کا سبب ان کی افسانہ نگاری بن گئی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ محمد افضل میر نے جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری کے امام پریم ناتھ پردیسی پر بہت ہی دقیقہ ریزی سے تحقیق کی ہے جس کا ثمرہ ''پریم ناتھ پردیسی۔ عکس در عکس' کی صورت میں منظر عام پر آرہا ہے۔ غیر منقسم ہندستان میں پریم ناتھ پردیسی کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور ان کا رابطہ ہندستان کے کئی قد آور ادیبوں سے قائم ہو چکا تھا یہاں تک کہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کا مقدمہ بابائے اردو عبدالحق نے رقم کیا جبکہ دوسرے مجموعے کا پیش لفظ شہرۂ آفاق افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے قلم بند کیا۔

زیر نظر تصنیف کو محمد افضل میر نے کئی ابواب میں تقسیم کیا ہے: ریاست میں اردو...... آغاز وارتقا؛ ریاست کا پہلا افسانہ نگار کون؟، پریم ناتھ پردیسی۔ شخصیت کے بعض

اہم پہلو؛ پریم ناتھ پردیسی کی شعروادب سے وابستگی؛ پریم ناتھ پردیسی بحیثیت افسانہ نگار؛ پریم ناتھ پردیسی بحیثیت ڈرامہ نگار؛ پریم ناتھ پردیسی بحیثیت رپورتاژ نگار؛ پریم ناتھ پردیسی بحیثیت شاعر؛ پریم چند کے اثرات اور معاصرین؛ ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی پردیسی کے بارے میں آراء۔ظاہر ہے کہ محقق نے پریم ناتھ پردیسی کی شخصیت کے ہرزاویئے اوران کے فن کے ہر پہلو پر بہ نظر غائر روشنی ڈالی ہے۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ کشمیر میں اردو کا چلن ڈوگرہ حکومت کے دوران شروع ہوااور مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جواب تک قائم ودائم ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ریاست جموں وکشمیر میں کئی زبانیں رائج تھیں جیسے کشمیری، پہاڑی، ڈوگری، لداخی وغیرہ جن کا دائرہ اثر مخصوص خطوں تک محدود تھا،اس لیے ایک مشترکہ ومخلوط زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جواردو نے پوری کردی۔اردو کی ترویج کی ابتدا پنجاب میں کشمیری نژاد صحافیوں کی نگارشات سے ہوئی، سفرنامے، تاریخیں اور دیگر تخلیقات لکھی گئیں، پھر ریاست کے اندر اخباروں کا سلسلہ سرکاری پرچے 'بدھیا بلاس' سے شروع ہوا اور ساتھ ہی جموں میں دارالترجمہ بھی قائم کیا گیا۔ جلدی ہی ریاست میں اخباروں کا سیلاب امڈ آیا اور اخبار عام، رنبیر، ملاپ، وتستا، مارتنڈ اور ہمدرد جیسے اخبارات منصۂ شہود پر رونما ہوئے۔ باہر سے تھیٹر کمپنیاں بھی اپنے جلوے دکھانے کے لیے وارد ہوئیں جن کے مکالمے ہندستانی میں ہوتے تھے۔اِدھر کئی پرائیویٹ اداروں جیسے انجمن نصرت اسلام نے مدرسوں میں اردو کو بڑھاوادیا۔محمد افضل میر نے کشمیر کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ یہ متنازع اور ذود حس موضوع ہے اس لیے میں اس بارے میں اپنے خیالات کو محفوظ رکھنا ہی بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے اظہار کا یہاں پر موقع ہے نہ محل۔صرف اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ غیر منقسم ہندستان میں کشمیر بھی دوسرے علاقوں میں آئی بیداری

کا حصہ بن گیا اور ادبی میدان میں جتنی بھی تحریکیں چلیں ان کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلتا رہا۔علاوہ ازیں اردو ادب کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے کئی ادبی محفلوں کی تشکیل ہوئی جیسے بزم سخن، انجمن ترقی پسند مصنفین، کلچرل فرنٹ وغیرہ جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ریاست میں ادیبوں کی ایک نئی عبقری و بیدار فوج کھڑی کردی بلکہ یہاں کے لوگوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔

پریم ناتھ پردیسی اس ترقی پسند کارواں کے سپہ سالار تھے۔ان کا جنم سرینگر کے محلہ فتح کدل میں ۱۹۰۹ء میں ہوا (میونسپلٹی ریکارڈ میں بقول تحقیق نگار ۱۹۱۰ء درج ہے)۔ ذہنی تربیت اپنے دادا مکند کول نے کی ، جو فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، وساطت سے ہوئی چنانچہ وہ اپنے گھر میں ادیبوں اور شاعروں کی مجلسوں کا انعقاد کرتے تھے۔بچپن میں والد مہادیو کول کی ناگہانی موت کے سبب پریم ناتھ سادھو میٹرک کے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اس لیے محکمہ کسٹمز وایکسائز میں بطور محال دار ملازمت اختیار کی۔غیر منقسم ریاست میں دور دراز علاقوں میں گھومنا پڑتا تھا جس کے باعث وہ اپنی صحت کا خیال نہ رکھ سکے لیکن اس کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلا۔انھیں عام لوگوں کے رہن سہن کے متعلق چشم دید جانکاری حاصل ہوئی۔ان کے حساس دل پر لوگوں کی کسمپرسی، غربت، افلاس اور جاگیرداری نظام میں ان پر ہو رہے استحصال کے منفی نقوش مستقل طور پر ثبت ہوگئے۔حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ ایکسائز کی نوکری کرنے کے باوجود انھوں نے ایمانداری کا دامن نہ چھوڑا اور سبکدوشی کے وقت ان کی تنخواہ محض ۸۰/روپئے ماہانہ تھی۔۱۹۴۷ء میں جب سرینگر میں ریڈیو کشمیر کا افتتاح ہوا تو پریم ناتھ پردیسی کو بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ ملازم رکھا گیا اور وہاں بھی انھوں نے کار ہائے نمایاں انجام دیے۔کھانے پینے کے معاملے میں پردیسی کے صاحب ذوق ہونے پر مجھے محقق کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ کشمیری پنڈت گوشت کھانے میں زیادہ دلچسپی

نہیں رکھتے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں میں کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں میں گوشت خوری عام سی بات ہے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں پریم ناتھ پردیسی عنفوان شباب میں سورگ باش ہو گئے۔

پریم ناتھ پردیسی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی اور پھر افسانوی مجموعے 'انگارے' اور ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر افسانے کی جانب راغب ہو گئے۔ افسانہ نگاری کی طرف مڑنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف بغاوت کا بگل بجا اور کئی دل دہلانے والی وارداتیں نمو پذیر ہوئیں۔ ان دنوں ادبی دنیا میں پریم چند کا طوطی بول رہا تھا۔ پریم ناتھ پردیسی بھی دھیرے دھیرے ان کے رنگ میں رنگ گئے اور آخرکار 'کشمیر کا پریم چند' کہلائے۔ پریم چند کی طرح ہی تحقیق نگار آج تک یہ ثابت نہیں کر پائے کہ کیا پردیسی ریاست کے اولین افسانہ نگار تھے یا نہیں کیونکہ پنڈت شیام لال ولی، تیرتھ کاشمیری، منشی محمد دین فوق اور چراغ حسن حسرت کے نام بھی اس ضمن میں سامنے آتے ہیں۔ خیر یہ مفروضہ ابھی تحقیق طلب ہے۔ اپنے ادبی سفر کے دوران پریم ناتھ پردیسی نے کئی نام اختیار کیے مثلاً پریم ناتھ سادھو رونقؔ، رونق کاشمیری، سادھو کاشمیری اور پریم ناتھ پردیسی۔ چونکہ ملازمت کے دوران کالم نگاری بھی کرتے تھے اس لیے سرکاری عتاب سے بچنے کے لیے کچھ فرضی قلمی نام بھی رکھ لیے مثلاً بابو، مالک رام باری، علامہ علائی وغیرہ۔ شاعری میں ان کا رجحان غزلوں کی طرف رہا گو کبھی کبھار وقتی تقاضے کو دیکھ کر نظمیں اور نثری نظمیں بھی کہہ لیتے تھے۔ ان کی کئی نظمیں بھکتی سے بھرپور ہیں جو کرشن، رادھا، شیو، اور ماں بھگوتی کے بارے میں ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی نظمیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۲۴ء میں ہفت روزہ اخبار عام میں شائع ہوئی تھی مگر ۱۹۳۲ء میں وہ شاعری سے بدظن ہوئے اور افسانہ نویسی کی طرف راغب ہوئے

حالانکہ اس کے بعد بھی ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں منظر عام پر آتی رہیں۔ ان کی ایک نظم 'بے کار نوجوان' میں علامہ اقبال کا اثر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔

ٹوٹ نہ جائے کہیں غافل حبابِ زندگی
اپنی ہمت سے دکھا کچھ انقلاب زندگی

انجمن سازی کا شوق بھی پردیسی کو تھا۔ پہلے حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ہو گئے، اس کے بعد رامانند ساگر کے باہمی اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ پھر نیشنل کلچرل فرنٹ وجود میں آیا۔ انھیں دنوں پردیسی کشمیر کی سیاسی تحریک سے بھی وابستہ ہو گئے کیونکہ کشمیر پر قبائلوں کا حملہ ہو چکا تھا۔ اسی کا ایک وِنگ نیشنل ملیشیا تھا جس کے وہ خود رکن بن گئے اور عملی و ہتھیار بند طور پر کشمیر کی نگرانی میں جُٹ گئے۔ نیشنل کلچرل فرنٹ بعد میں کلچرل کانگریس بن گئی۔ پردیسی کی یہ عملی زندگی ان کے نظریے اور حب الوطنی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

ایک بات جو پریم ناتھ پردیسی کو اختصاص بخشتی ہے وہ یہ کہ موصوف سیکولر، جمہوریت پسند، دردمند اور غریبوں و پسماندہ لوگوں کے ہمدرد تھے۔ کشمیر سے متعلق افسانے تو باہری قلم کاروں جیسے کرشن چندر، عزیز احمد وغیرہ نے بھی لکھے ہیں البتہ انھوں نے کشمیری زندگی کو صبح کی تجلی اور شام کی لالی میں دیکھا مگر ان میں پھیلی تاریکیوں اور دل خراشیوں کو نہیں دیکھ پائے۔ باہری افسانہ نگاروں نے کشمیری حسیناؤں کے چہروں کے نور اور لبوں کی سرخی کو دیکھا مگر ان میں بسی مجبوریوں اور لاچاریوں کو نہیں دیکھ پائے۔ وہ ایوانوں میں بیٹھ کر افسانے گھڑتے رہے لیکن کشمیر کی زمینی حقیقت سے بے خبر رہے۔ سجاد حیدر یلدرم سکول کے افسانہ نگاروں نے رومانی افسانوں کو اپنا شیوہ بنایا تھا جبکہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے حقیقت پسندی کو اپنا طرز انداز بنایا۔ جس دور میں پریم ناتھ پردیسی کا ظہور ہوا اس وقت

افسانہ نگار یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کس اسلوب کو اپنایا جائے۔ ان دنوں کشمیر کی خوبصورتی اور پری پیکر دوشیزاؤں نے افسانہ نگاروں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا اور قارئین رومانی جنون میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس پس منظر میں کرشن چندر نے درمیانی راہ نکال کر رومانی حقیقت پسندی اختراع کی۔ وہ من گھڑت وفرضی کشمیری حسن ومناظر کی باتیں لکھتے رہے اور پڑھنے والوں سے واہ واہ بٹورتے رہے جبکہ سچ یہ ہے کہ وہ، ماسوائے گلمرگ کے آسودہ ہوٹل میں دو مہینے ٹھہر کر ناول لکھنے کے، کشمیر میں کبھی رہے ہی نہیں۔ البتہ وہ پونچھ میں رہے جو جموں کا حصہ ہے اور 'چھوٹا کشمیر' کہلاتا ہے۔ اس لیے تحقیق نگار کا یہ معروضہ کہ "کرشن چندر نے کشمیر کے ماحول میں ہی پرورش پائی اور کشمیر میں ہی اپنی زندگی کا آغاز بھی کیا" اور "کرشن چندر نے پنجاب میں جنم لیا تھا لیکن اس کا سارا بچپن کشمیر میں گزرا تھا" صحیح نہیں ہے اور تحقیق طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باہری افسانہ نگاروں کو نہ تو مہاراجہ کی استحصالی کارروائیوں کا تجربہ تھا اور نہ ہی کشمیری عوام کی مفلوک الحالی کا علم تھا۔ اس کے برعکس پریم ناتھ پردیسی کشمیری تھے، انھوں نے اس زندگی کو جیا اور برتا تھا اور اس سے نجی طور پر نبرد آزما ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں کشمیری زندگی کی صحیح نمائندگی ملتی ہے۔ ہاں ابتدائی کچھ سالوں تک وہ رومانی نرغے میں پھنسے رہے جس کا انھیں بعد میں افسوس ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ 'سچی پرارتھنا' ۱۹۳۲ء میں رنبیر جموں میں شائع ہوا تھا۔ بچوں کے لیے بھی ان کی کچھ کہانیاں سادھو کاشمیری کے نام سے 'رتن' اور 'پھول' میں چھپی تھیں۔ ادبِ اطفال سے تعلق رکھنے والی چند نگارشات کے نام یوں ہے: چورنگی جانباز بچے، کرنیں اور بچے کی ڈائری۔ ذہنی طور پر وہ پریم چند کی مانند ہی ترقی پسند تھے اور عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے دیگر ترقی پسندوں کی طرح نہ تو کسی نظریے کو اپنایا اور نہ ہی اس کا پروپیگنڈہ کیا۔

پریم ناتھ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں: شام و

سحر (۱۳/افسانے/۱۹۴۱ء)؛ دنیا ہماری (۱۴/افسانے/۱۹۵۱ء) اور بہتے چراغ (۲۰/افسانے/۱۹۵۵ء)۔ کچھ افسانے طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ انھوں نے گاؤں کی زندگی کی عکاسی اسی خوبصورتی سے کی ہے جیسے شہری زندگی کی۔ پریم ناتھ پردیسی کے افسانے پڑھ کر ان کی فکری بصیرت، تحقیقی صلاحیت، نفسیاتی مشاہدے، سماجی رشتوں اور سیاسی اتار چڑھاو کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے موضوعات میں رنگا رنگی، تکنیک میں کساؤ، کردار نگاری میں پختگی، منظر نگاری میں حقیقت طرازی اور اسلوب نگارش میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بتدریج ارتقائی منزلوں کا سراغ ملتا ہے۔ پردیسی کے پہلے افسانوں کے مجموعے میں وہ فکر کی بالیدگی، ترقی پسندی کی شدت اور فنی پختگی نہیں ملتی جو بعد کے مجموعوں میں ملتی ہے۔ افسانہ 'چونّی' میں ایک ماں چونّی کی خاطر اپنی بیٹا کھو دیتی ہے، 'فرشتہ رحمت' میں ایک کسان نمبردار کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے جب کہ 'اجرت' میں ایک عورت کی عزت لوٹنے کا ارادہ کرنے والا جلدی ہی تائب ہو جاتا ہے۔ دوسرے مجموعے کے افسانوں کی تقسیم یوں ہیں: دنیا ہماری (طبقاتی ذہنیت)، اگلے سال (مہاجنی تہذیب)، میرا حق (وفاداری)، سہارا (عورت کی لاچاری)، کاریگر (فن کار کا استحصال)، سائڈ لائن (بے روزگاری)، چتائیں (بیوہ کی باز آبادکاری)، لباس تلے (امیر و غریب کی خلیج)، لہروں کا رقص (مزدوروں کی کسمپرسی) اور فرار (بچے کی آمد پر امیر اور غریب کا ردعمل)۔ افسانہ 'کاریگر' میں پریم ناتھ پردیسی نے 'اژدھا' کو بڑی ہنروری سے مداوا کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ تیسرے مجموعے میں کئی فکر انگیز اور شاہکار افسانے ملتے ہیں: ڈھول (عورتوں پر جبر)، اجالے اندھیرے (ٹیکس کے معاملے میں امتیازی سلوک)، کتبے (ایک غریب کی امر بننے کی خواہش)، ان کوٹ (قحط سالی کے دوران عوام کی بے عزتی)، سوغات (بدلتے اقدار)، سیلز مین (تاجرانہ ذہنیت)، دیوتا کہاں ہیں (خدا کو رجھانا اور مخلوق کو

دھتکارنا)، نئی صبح (قبائلوں سے لڑنے کا عزم)، امام صاحب (تیقن وقناعت)، سنکرات (بچہ مزدوری اور خودغرضی کی لعنت)، جھنجھنا (مشترکہ کنبے کی پریشانیاں)، نئی سڑک (روحانی مسرت)، بجھتے چراغ (جنگ اور امن کا تضاد)۔ پریم ناتھ پردیسی نے پریم چند کی کئی کہانیوں جیسے 'کفن' کی تتبع میں کہانیاں لکھی ہیں۔ پردیسی کے یہاں انفرادی واجتماعی دکھ درد، خیروشر کا تصادم، اقتصادی نابرابری، سرکاری جبروتشدد، انسانی محرومی ولاچاری، رجعت پسندی ومذہبی تعصبات کی نفی، عورتوں پر ہورہے ظلم وجبر اور توہم پرستی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ 'ان کوٹ' اور 'دیوتا کہاں ہیں؟' میں، جوان کے شاہکار اور مقبول ترین افسانے ہیں، افسانہ نگار نے منظر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق نگار نے ۵۲/غیر مطبوعہ افسانوں کا حوالہ دیا ہے جن کا ذکر برج پریمی نے کیا ہے اور مزید ۲۱/افسانوں کا انکشاف کیا ہے جن کو اس نے خود ڈھونڈ نکالا ہے۔

جہاں تک پردیسی کی ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے انھوں نے کئی ڈرامے جیسے قدگو جواری، سوالی، مجاہد شیروانی وغیرہ قلم بند کیے ہیں جو بہت ہی مقبول ہوئے۔ ریڈیو سے منسلک ہونے کے بعد ان کے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر بھی کافی مقبول ہوئے۔ ان کا ناول 'پوتی' بھی شائع ہوا تھا مگر نایابی کی وجہ سے اس کی تصدیق نہیں ہو پارہی ہے۔ رپورتاژ کے طور پر انھوں نے قبائلوں کی یورش کا رپورتاژ 'پانچ دن' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے جس میں ۲۲/اکتوبر سے لے کر ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء کی روداد بیان کی گئی ہے کہ کیسے کشمیر پر قبائلوں کا حملہ ہوا اور کس طرح کشمیریوں نے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔

مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ زیرنظر تحقیقی کتاب لکھ کر مصنف نے کشمیر کے اہم ترین افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کتاب کا مواد خود ہی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کے لکھنے میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور پھر کس

عرق ریزی سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہوگا۔ میں اس گراں قدر کتاب کے لیے مصنف کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ ان کے ذوق کا پہلا پائیدان ہوگا اور وہ آگے بھی بہت ساری منزلیں طے کرتے رہیں گے۔

دیپک بدکی



افسانہ نگار یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کس اسلوب کو اپنایا جائے۔ ان دنوں کشمیر کی خوبصورتی اور پری پیکر دوشیزاؤں نے افسانہ نگاروں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا اور قارئین رومانی جنون میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس پس منظر میں کرشن چندر نے درمیانی راہ نکال کر رومانی حقیقت پسندی اختراع کی۔ وہ من گھڑت و فرضی کشمیری حسن و مناظر کی باتیں لکھتے رہے اور پڑھنے والوں سے واہ واہ بٹورتے رہے جبکہ سچ یہ ہے کہ وہ، ماسوائے گلمرگ کے آسودہ ہوٹل میں دو مہینے ٹھہر کر ناول لکھنے کے، کشمیر میں کبھی رہے ہی نہیں۔ البتہ وہ پونچھ میں رہے جو جموں کا حصہ ہے اور 'چھوٹا کشمیر' کہلاتا ہے۔ اس لیے تحقیق نگار کا یہ معروضہ کہ ''کرشن چندر نے کشمیر کے ماحول میں ہی پرورش پائی اور کشمیر میں ہی اپنی زندگی کا آغاز بھی کیا'' اور ''کرشن چندر نے پنجاب میں جنم لیا تھا لیکن اس کا سارا بچپن کشمیر میں گزرا تھا'' صحیح نہیں ہے اور تحقیق طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باہری افسانہ نگاروں کو نہ تو مہاراجہ کی استحصالی کارروائیوں کا تجربہ تھا اور نہ ہی کشمیری عوام کی مفلوک الحالی کا علم تھا۔ اس کے برعکس پریم ناتھ پردیسی کشمیری تھے، انھوں نے اس زندگی کو جیا اور برتا تھا اور اس سے نجی طور پر نبرد آزما ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں کشمیری زندگی کی صحیح نمائندگی ملتی ہے۔ ہاں ابتدائی کچھ سالوں تک وہ رومانی نرغے میں پھنسے رہے جس کا انھیں بعد میں افسوس ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ 'سچی پرارتھنا' ۱۹۳۲ء میں رنبیر جموں میں شائع ہوا تھا۔ بچوں کے لیے بھی ان کی کچھ کہانیاں سادھو کاشیری کے نام سے 'رتن' اور 'پھول' میں چھپی تھیں۔ ادبِ اطفال سے تعلق رکھنے والی چند نگارشات کے نام یوں ہے: چورنگی جانباز بچے، کرنیں اور بچے کی ڈائری۔ ذہنی طور پر وہ پریم چند کی مانند ہی ترقی پسند تھے اور عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے دیگر ترقی پسندوں کی طرح نہ مارکسی نظریے کو اپنایا اور نہ ہی اس کا پروپیگنڈہ کیا۔

پریم ناتھ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں: شام و

سحر (۱۳/افسانے/۱۹۴۱ء)؛ دنیا ہماری (۱۴/افسانے/۱۹۵۱ء) اور بہتے چراغ (۲۰/افسانے/۱۹۵۵ء)۔ کچھ افسانے طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ انھوں نے گاؤں کی زندگی کی عکاسی اسی خوبصورتی سے کی ہے جیسے شہری زندگی کی۔ پریم ناتھ پردیسی کے افسانے پڑھ کر ان کی فکری بصیرت، تحقیقی صلاحیت، نفسیاتی مشاہدے، سماجی رشتوں اور سیاسی اتار چڑھاو کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے موضوعات میں رنگارنگی، تکنیک میں کساؤ، کردار نگاری میں پختگی، منظر نگاری میں حقیقت طرازی اور اسلوب نگارش میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بتدریج ارتقائی منزلوں کا سراغ ملتا ہے۔ پردیسی کے پہلے افسانوں کے مجموعے میں وہ فکری بالیدگی، ترقی پسندی کی شدت اور فنی پختگی نہیں ملتی جو بعد کے مجموعوں میں ملتی ہے۔ افسانہ 'چونّی' میں ایک ماں چونّی کی خاطر اپنی بیٹا کھو دیتی ہے، 'فرشتہ رحمت' میں ایک کسان نمبردار کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے جب کہ 'اجرت' میں ایک عورت کی عزت لوٹنے کا ارادہ کرنے والا جلدی ہی تائب ہو جاتا ہے۔ دوسرے مجموعے کے افسانوں کی تقسیم یوں ہیں: دنیا ہماری (طبقاتی ذہنیت)، اگلے سال (مہاجنی تہذیب)، میرا حق (وفاداری)، سہارا (عورت کی لاچاری)، کاریگر (فن کار کا استحصال)، سائڈ لائن (بے روزگاری)، چتائیں (بیوہ کی باز آبادکاری)، لباس تلے (امیر و غریب کی خلیج)، لہروں کا رقص (مزدوروں کی کسمپرسی) اور فرار (بچے کی آمد پر امیر اور غریب کا ردعمل)۔ افسانہ 'کاریگر' میں پریم ناتھ پردیسی نے 'اژدھا' کو بڑی ہنروری سے مداوا کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ تیسرے مجموعے میں کئی فکر انگیز اور شاہکار افسانے ملتے ہیں: ڈھول (عورتوں پر جبر)، اجالے اندھیرے (ٹیکس کے معاملے میں امتیازی سلوک)، کتبے (ایک غریب کی امر بننے کی خواہش)، ان کوٹ (قحط سالی کے دوران عوام کی بے عزتی)، سوغات (بدلتے اقدار)، سیلز مین (تاجرانہ ذہنیت)، دیوتا کہاں ہیں (خدا کو رجھانا اور مخلوق کو

دھتکارنا)، نئی صبح (قبائلوں سے لڑنے کا عزم)، امام صاحب (تیقن وقناعت)، سنکرات (بچہ مزدوری اور خود غرضی کی لعنت)، جھنجھنا (مشترکہ کنبے کی پریشانیاں)، نئی سڑک (روحانی مسرت)، بجھتے چراغ (جنگ اور امن کا تضاد)۔ پریم ناتھ پردیسی نے پریم چند کی کئی کہانیوں جیسے 'کفن' کی تتبع میں کہانیاں لکھی ہیں۔ پردیسی کے یہاں انفرادی واجتماعی دکھ درد، خیر وشر کا تصادم، اقتصادی نابرابری، سرکاری جبر وتشدد، انسانی محرومی ولاچاری، رجعت پسندی ومذہبی تعصبات کی نفی، عورتوں پر ہو رہے ظلم وجبر اور توہم پرستی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ 'ان کوٹ' اور 'دیوتا کہاں ہیں؟' میں، جوان کے شاہکار اور مقبول ترین افسانے ہیں، افسانہ نگار نے منظر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق نگار نے ۵۲/غیر مطبوعہ افسانوں کا حوالہ دیا ہے جن کا ذکر برج پریمی نے کیا ہے اور مزید ۲۱/افسانوں کا انکشاف کیا ہے جن کو اس نے خود ڈھونڈ نکالا ہے۔

جہاں تک پردیسی کی ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے انھوں نے کئی ڈرامے جیسے قدگو جواری، سوالی، مجاہد شیروانی وغیرہ قلم بند کیے ہیں جو بہت ہی مقبول ہوئے۔ ریڈیو سے منسلک ہونے کے بعد ان کے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر بھی کافی مقبول ہوئے۔ ان کا ناول 'پوتی' بھی شائع ہوا تھا مگر نایابی کی وجہ سے اس کی تصدیق نہیں ہو پا رہی ہے۔ رپورتاژ کے طور پر انھوں نے قبائلوں کی یورش کا رپورتاژ 'پانچ دن' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے جس میں ۲۲/اکتوبر سے لے کر ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء کی روداد بیان کی گئی ہے کہ کیسے کشمیر پر قبائلوں کا حملہ ہوا اور کس طرح کشمیریوں نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ زیرِ نظر تحقیقی کتاب لکھ کر مصنف نے کشمیر کے اہم ترین افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کتاب کا مواد خود ہی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کے لکھنے میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور پھر کس

عرق ریزی سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہوگا۔ میں اس گراں قدر کتاب کے لیے مصنف کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ ان کے ذوق کا پہلا پائیدان ہوگا اور وہ آگے بھی بہت ساری منزلیں طے کرتے رہیں گے۔

دیپک بدکی



ریاست میں اردو

آغاز وارتقاء

ریاست کی ادبی تاریخ کو ہندوستان کی سب سے پرانی ادبی تاریخ تصوّر کیا جاتا ہے۔اگرچہ ریاست میں اردو زبان کی عمر یہی کوئی ڈیڑھ سو برس کے آس پاس کی ہے لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ،جن کا عہد حکومت ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۶ء صرف ۱۰ برس تک رہا لیکن اتنے کم عرصہ میں انھوں نے ریاست کے معاملات دہلی اور لاہور کے درباروں کے ساتھ استوار کیے۔اس زمانے میں بھی وسائل معاش اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں بہت سے لوگ ریاست سے باہر جانے لگے تھے۔جہاں انہیں سپاہیوں اور تجارت پیشہ لوگوں کی آپسی میل جول کی وجہ سے اردو سے واقفیت حاصل ہوئی۔مہاراجہ رنبیر سنگھ نے (۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء) تک کشمیر پر اپنی حکومت کی اور ڈوگرہ سرکار کی استقامت کے لیے کافی اقدامات اٹھائے۔رنبیر سنگھ کے دور میں اُردو کو ریاست میں خوشگوار ماحول ملا،کیونکہ مہاراجہ نے اپنے دربار میں جید علماء اور فضلاء کو جمع کیا تھا۔اگرچہ یہ عالم فارسی زبان میں نہایت ہی گہرا ادراک رکھتے تھے اور ساتھ ہی اردو زبان بھی وسیلہ اظہار تھی۔یہی وہ زمانہ تھا جب پہلی بار سرکاری بیانات اُردو میں قلمبند کیے جانے لگے اور یوں ریاست میں اردو نثر و نظم کے لیے

میدان ہموار ہوا۔

سنسکرات زبان نے جموں و کشمیر میں چودھویں صدی تک علمی و ادبی خدمات سرانجام دینے میں نمایاں کردار ادا کیا، لیکن اس کے بعد ہی اس زبان کا زوال شروع ہوا اور آہستہ آہستہ فارسی نے اس کی جگہ لی۔ کشمیر میں اسلامی عہد کے دوران فارسی نے بہت ترقی کی۔ نتیجتاً فارسی نے درباری زبان کی حیثیت اختیار کی اور تقریباً چھ سو سال تک اس زبان کا غلبہ رہا۔ ۱۶/ مارچ ۱۸۴۶ء میں عہد نامہ امرتسر کی رو سے مہاراجہ گلاب سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کی بنیاد رکھی اور اس سلسلے میں ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"ڈوگرہ سلطنت کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی لیکن خطہ جموں کے بیشتر علاقوں میں ڈوگری زبان کا بول بالا تھا۔ جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے اس لیے اردو زبان یہاں پر ادبی خدوخال مرتب کر چکی تھی"۔[1]

لیکن جب حکومت رنبیر سنگھ کے ہاتھوں میں آئی تو کشمیر کے سیاسی حالات میں سدھار آ گیا۔ جس کی وجہ سے مختلف ملکوں اور ریاستوں سے کافی تعداد میں سیاحوں نے جموں و کشمیر کا رخ کیا۔ اور ان سیاحوں کا وہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ لین دین ایک لازمی امر تھا اور اس طرح اردو زبان ان کے اور قریب آ گئی اس بارے میں پروفیسر ظہور الدین رقم طراز ہیں۔

"جہاں تک اردو بان کی توسیع کا تعلق ہے تو ڈوگرہ حکمرانوں کا کردار قابلِ ستائش ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے دونوں ڈوگرہ حکمرانوں یعنی مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں

فارسی ہی سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی تھی لیکن فارسی کبھی
بھی یہاں کے عوام کی زبان نہ بن سکی یہ صرف شرفاء کی زبان تھی۔
عوام کے لیے سرکاری دفاتر میں بھی جس زبان کو استعمال کیا جاتا تھا
وہ اردو ہی تھی''۲

مہاراجہ رنبیر سنگھ خود بھی علم و ادب کے شیدائی تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے دربار میں اچھے عالم و فاضل جمع کیے تھے جن میں مہاراجہ کا وزیر اعظم دیوان کرپارام، پنڈت صاحب رام، بخشی رام، گنیش کنول، حکیم نورالدین قادیانی، مولوی غلام حسن اور نصر اللہ عیسائی قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے جموں میں سنسکرت کالج لائبریری اور دارالترجمہ کی تعمیر کی اور اسی دور میں چودھری شیر سنگھ کا اردو سفر نامہ پہلی سرکاری کوشش تصور کی جاتی ہے۔ اس بارے میں برج پریمی لکھتے ہیں:

''یہ ریاست کی پہلی اردو تحریر تسلیم کی گئی، ایک سو پچاس صفحات پر
مشتمل یہ سفر نامہ بڑا دلچسپ ہے''۳

اس سب کے باوجود مہاراجہ نے کشمیر کے معاشی استحکام کے لیے بھی کافی کوششیں کیں۔ خاص کر انہوں نے انگور اور چائے کی کاشت کو ممکن بنایا اس کے پیش نظر لالہ بوتامل نے ایک رسالہ اردو میں لکھ کر مہاراجہ کو پیش کیا تھا۔ اس بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''ریاست میں چائے اور انگور کی کاشت کے امکانات بھی دریافت
کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ بوتامل نے چائے کی کاشت کی
تفصیلات پر ایک رسالہ اردو میں ہی لکھ کر مہاراجہ کی خدمت میں پیش
کیا تھا''۴

مہاراجہ نے ۱۸۸۶ء میں ''بدیابلاس'' پریس جموں میں قائم کیا اور بعد میں ''بدیا بلاس'' نام سے ہی ایک اخبار بھی جاری کیا، جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس عہد کے ادیبوں میں پنڈت گوپال رام خستہؔ کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے جو مہاراجہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے نثری کارناموں میں ''گلدستہ کشمیر'' اردو نثر میں کشمیر کی پہلی تاریخ ہے جو ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی متعدد تصانیف میں خستہ برادران نے کشمیری قوم اور خاص کر اُردو ادب کی جس طرح خدمت کی وہ قابلِ ستائش ہے لیکن مہاراجہ نے صرف شک کی بنا پر ان کو سزا دی اور بعد میں جلاوطن کیا۔

اس بارے میں عبدالقادر سروریؔ اپنی کتاب کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جب کشمیر میں قحط پڑا تھا اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف یہ مخبری کی گئی تھی کہ وہ لوگوں کے لیے غلہ کا انتظام نہ کر سکنے کے سبب انہیں بوروں میں بھر کر کشتی میں بھجواتے اور اور ولر جھیل میں ڈبو دیتے ہیں۔ اس پر برطانوی حکومت نے مہاراجہ سے باز پرس کی اور مقدمہ غیر قیدگی ان کے خلاف قائم ہو گیا۔ کسی نے مہاراجہ کو یہ سمجھایا کہ انگریزوں کے پاس مخبری کا کام ہرگوپال خستہؔ کا ہے۔ جنہوں نے اپنے بھائی کے توسط سے جنہیں ریزیڈینسی میں اس غرض سے پہلے ہی نوکر رکھوادیا تھا، مہاراجہ کے خلاف مخبری کی ہے اس پر مہاراجہ دونوں بھائیوں سے بدظن ہو گئے اور ان پر ایک مقدمہ قائم کر کے جموں میں باہو کے قلعہ میں قید کر دیا'' [5]

۱۸۸۵ء میں مہاراجہ کی وفات کے بعد پرتاپ سنگھ نے ڈوگرہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور صرف تین سال کے بعد اردو کو ۱۸۸۹ء میں سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔

سرکاری یا دفتری زبان بننے کے بعد اُردو زبان نے کشمیر میں کافی ترقی کی اور کئی ادیبوں اور شاعروں نے اس کے دامن میں پناہ لی۔ آہستہ آہستہ اردو جموں و کشمیر کی موثر تخلیقی زبان بن گئی۔ مذید براں اردو زبان نے ریاست کے تینوں خطوں اور ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ رابطے کی واحد اور مربوط زبان کا کردار بھی ادا کیا۔ اس کے بعد مدرسوں، اسکولوں، کالجوں، دفاتر اور دیگر سرکاری کام کاج بھی اسی زبان میں ہونے لگے۔ اس بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''اردو کا جہاں تک تعلق ہے وہ ریاست میں نصف آخر میں متعارف ہوئی۔ اس زمانے میں ریاست پر ڈوگرہ راجاؤں کی حکومت تھی اور کہیں ایسے حالات پیدا ہوئے تھے جو ریاست میں اردو کو روز بروز مقبولیت حاصل کرنے اور یہاں کی سماجی، سرکاری اور تہذیبی زندگی میں قدم جمانے میں سازگار ثابت ہوئے'' [۶]

ریاست میں اردو زبان کے بارے میں محققین کے مختلف نظریات ہیں لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال، پروفیسر نذیر احمد ملک وغیرہ نے عام رائے قائم کی ہے کہ اردو زبان کشمیر میں ڈوگرہ دور کے آس پاس ہی پروان چڑھی۔ جبکہ بعض لوگ اس بات سے انکار کرتے ہیں اور ان کی رائے کے مطابق کشمیر میں اردو کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اب حقیقت کیا ہے اس کا فیصلہ آنے والی تحقیق ہی کرسکتی ہے۔ کشمیر کے معروف نقاد محمد یوسف ٹینگ اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو خرید کے جموں و کشمیر کی متحدہ ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس سے قبل ہمیں کشمیر میں اردو کے چلن

کے متعلق کوئی تفصیلی حوالے تو نہیں ملتے لیکن مختلف شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اردو ہمسایہ پنجاب سے یہاں پہنچ چکی تھی۔ افغان عہد کے فارسی شاعر دیارام کاچرو خوشدل (ولادت ۱۷۴۴ء) کا اردو شعر ملاحظہ ہو۔

آ گئے تھے مثل شبنم سیر گلشن کر دیے
باغبان تو دیکھ اپنا چمن ہم گھر چلے

ے

جدید کشمیری زبان کے اولین استاد محمود گامی (وفات ۱۸۵۵) کے کشمیری کلام میں ٹھیٹھ اُردو کے ایسے مصرعے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

تنو فریاد میری ہے خدایا
اُسی کو چارہ مانگو وقتِ مشکل

کشمیر میں اردو کے چلن کے مطابق ایک انگریز افسر فیڈرک ڈریو نے اپنی کتاب میں کچھ دلچسپ اشارے کیے ہیں یہ شخص ۱۸۶۲ء میں ریاست میں طبقات لارض (Geologist) کے ماہر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس نے مہاراجہ کے دربار کی زبان کے متعلق لکھا ہے۔

''ہندوستان سے آنے والے لوگ بلاشبہ ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اس سے سمجھ لیتے ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے جانشین رنبیر سنگھ کے ذاتی محافظ دستہ رام پور کے روہیلوں پر مشتمل تھا جو اردو بولتے تھے۔ شاہی دربار کی زینت کو دوبالا کرنے کے لیے

لکھنؤ اور دہلی سے نقیب بھی ملازم رکھے گئے تھے جو دربار کو اپنی گونج
دار آواز سے پُروقار بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف
طائفے اور اہلِ نشاط بھی جموں و کشمیر جاتے تھے اور ان کی گائی ہو
غزلیں فوراً مقبول ہوتی تھیں۔

اس کے علاوہ بیرون ریاست سے کچھ سیاح بھی کشمیر آتے تھے
، چنانچہ ہرگوپال خستہ نے لکھا ہے کہ بازار میں عام کشمیری ان سے
اردو میں آسانی کے ساتھ بات چیت کر سکتے تھے۔'' 8

گلاب سنگھ نے حکومت کو وسیع کرنے کے چکر میں تہذیبی اور ادبی زندگی میں کوئی
نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اردو کی دھوم تھی۔ جو اس وقت
پنجاب اور ہندوستان کے وسیع علاقوں کی ادبی زبان کا روپ اختیار کر چکی تھی اور ولیؔ، میرؔ،
غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ناسخ اور آتش وغیرہ کے ہاتھوں اردو نے قدر و منزلت کی بہت سی
منزلیں طے کر لی تھیں۔ جب گلاب سنگھ کے بیٹے کو استحکام سلطنت سے تھوڑی بہت فرصت
ملی تو اس وقت پورے برصغیر میں علم و ادب کے سرچشمے پھوٹ چکے تھے۔ رنبیر سنگھ نے
حکومت سنبھالنے کے بعد پوری ریاست کے نظم و نسق کو یکسر تبدیل کر دیا۔ انہوں نے
جو قوانین بنائے وہ سب اُردو میں تھے اور اس کو ''رنبیر دھنڈ بدھی'' کے نام سے جانا جاتا ہے
اور اس وقت کے مایہ ناز ادیبوں نے اس کی شرح بھی اردو میں ہی لکھی تھی۔

گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کے وقت اگرچہ فارسی زبان ہی کشمیر کی دفتری زبان تھی
لیکن حکومت کی عدم توجہی سے آہستہ آہستہ اردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ ان دنوں زبان
کی حد تک ایک خلیج پیدا ہو گئی تھی جسے اردو نے ہی پُر کیا۔

سکھوں کے دَور سے ہی کشمیر کے تعلقات پنجاب سے بہت گہرے تھے۔ اس

وقت لاہور میں اردو ادب بہت ہی عمدہ طریقے سے ترقی کر رہا تھا اور مختلف ذرائع سے یہ علم وفن کی ترقیاں جموں و کشمیر بھی پہنچ رہی تھیں، چونکہ گلاب سنگھ کی فوج انگریزوں کی مدد کے لیے دلی میں بغاوت کچلنے کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ وہ فوجیں دہلی میں بہت عرصہ تک مقیم رہیں اور ان کے وہاں مقیم رہنے سے ان کا اردو سے ایک خاص ربط پیدا ہوا۔ اور واپس آ کر انہوں نے اردو زبان کو ہی روزمرہ کی زندگی میں وسیلۂ اظہار بنایا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دَور سے ہی اردو زبان اسکولوں میں تعلیم و تفہیم کا ذریعہ رہی۔ اور ساتھ ہی ریاست کے طالبِ علموں تک نئے علوم پہنچانے کے لیے دارالترجمہ قائم کیا، تاکہ لوگ بیرونی علوم سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ ان میں عربی، ہندی، سنسکرت، اُردو وغیرہ سب کتابیں شامل تھیں۔ دارالترجمہ میں رنبیر سنگھ کے دور میں سب سے زیادہ کتابوں کو اردو میں ترجمہ کروایا گیا۔ اس دارالترجمے کے ناظم پنڈت گوبند کول تھے اور صدارت کے فرائض مولوی عزیز الدین انجام دیتے تھے۔ اننت رام اپنی کتاب ''ریاست میں فارسی زبان کا ارتقاء'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ریاست کا پہلا چھاپہ خانہ ''ودیا بلاس پریس'' تھا اس میں اردو اور فارسی کے علاوہ ناگری رسم الخط میں بھی کتابیں چھاپی جاتی تھیں''۔ 9

مہاراجہ کے دور میں ہی اردو ریاست میں رابطے کی زبان بھی بن گئی اور اچھی خاصی ترقی بھی کی۔ ریاست کی سماجی، اجتماعی اور سرکاری زندگی میں اہم خدمت اردو ہی ادا کر رہی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات ۱۵ ستمبر ۱۸۸۵ء کو جموں میں ہوئی اور اس کے بعد رنبیر سنگھ کے بڑے بیٹے نے ڈوگرہ حکومت کا تخت سنبھالا، جس کا نام مہاراجہ پرتاپ سنگھ تھا۔ اس وقت پرتاپ سنگھ کی عمر ۳۵ سال تھی اور وہ علم وفن اور حکمرانی میں اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ اسکے چالیس سال دورِ اقتدار یعنی ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۵ء تک کشمیر میں برطانیہ سامراج کی مداخلت

سب سے زیادہ بڑھ گئی۔

تعلیم وتربیت کے میدان میں مہاراجہ نے بہت کوششیں کیں لیکن وہ سودمند ثابت نہ ہوسکیں۔ پرتاپ سنگھ نے ۱۹۰۵ء میں شری پرتاپ کالج کی بنیاد ڈالی۔ جو کشمیر کے علمی ماحول میں کافی معاون ومددگار ثابت ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اسی دور میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے جموں میں ایک ڈوگرہ سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اسی عرصہ میں جب مسلمانانِ کشمیر نے تھوڑی راحت پائی تو اس وقت کے میر واعظِ کشمیر غلام رسول شاہ نے انجمنِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی، جس کا نام بعد میں ''انجمن نصرت الاسلام'' رکھا گیا۔ اور اس کا کام مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو فروغ دینا تھا۔ جس کے تحت اس انجمن نے پوری ریاست میں مدرسے قائم کیے۔ انجمن کے مدارس میں اُردو کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اس انجمن نے اپنی تاسیس کے سالانہ جلسے بھی منعقد کروائے۔ ان جلسوں میں برصغیر کے نامور علماء اور ادباء تشریف لاتے تھے۔ ان تقریبات میں ہندو سکالر بھی اپنی شرکت کا بھرپور اظہار کرتے تھے۔ اس انجمن کی تقریبات میں علامہ اقبالؒ، الطاف حسین حالیؒ نے بھی ایک بار شرکت کی ہے۔ انجمن کے ان جلسوں سے اُردو کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

نصرت الاسلام کے قیام کے فوراً بعد پرتاپ سنگھ نے کشمیر میں ایک سناتن دھرم سبھا قائم کی اور خود مہاراجہ اس سبھا کے سرپرست بھی رہے۔ اور اس کو احسن طریقے سے چلانے کا کام سالگ رام سالک کے ذمہ رکھا گیا۔ اور اس سبھا کی پوری کارروائی اردو میں ہوتی تھی۔ بعد میں اسی سبھا نے کشمیر کے مایہ ناز اخبار روزنامہ ''مارتنڈ'' کا اجراء بھی عمل میں لایا۔ جس کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور میں بہت اچھے شاعر اور انشاء پرداز منظر عام پر آئے، جن میں پنڈت شیوناتھ منظرؔ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اردو اور فارسی کے بہت

اچھے شاعر گزرے ہیں۔ مہاراجہ ان کے بہت قدر دان تھے اس کے علاوہ پنڈت ٹھاکر پرشاد بھی بہت اچھی غزلیں کہہ لیتے تھے۔ پنڈت نرنجمن ناتھ رینہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ اچھے مصنف بھی تھے۔ اسی زمانے میں حسن ڈار نامی ایک انقلابی شاعر بھی پیدا ہوا۔ ان کے بارے میں محمد دین فوق کہتے ہیں کہ حسن ڈار نے افغان دور کے مظالم کو اپنی شاعری میں خوب اجاگر کیا۔

ریاست جموں وکشمیر میں چھاپہ خانوں کا آغاز ۱۸۵۸ء میں احمدی پریس سے ہوا لیکن سرکاری طور پر ''وکرم ولاس پریس'' ہی جموں وکشمیر کا پہلا چھاپہ خانہ تصور کیا جاتا ہے ،جس نے اردو زبان کی ترویج کے لیے کافی کام کیا۔ کیونکہ ان دنوں جب یہ سرکاری چھاپہ خانہ لگایا گیا یعنی ۱۸۶۶ء میں اردو کی مقبولیت روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ کشمیر کا پہلا اخبار ''بدیا بلاس'' جو خود رنبیر سنگھ نے اپنے دور حکومت میں ہی شروع کیا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

> ''ریاست سے ایک اردو اخبار نکالنے کی کوشش بہت پہلے سے شروع ہوئی تھی۔ ریاست کا پہلا اخبار ''بدیا بلاس'' جو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں جاری کیا تھا۔ یہ اردو اور ہندی دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا'' [۱۰]

ریاست سے اردو اخبار نکالنے کی کوشش بہت سے ادیبوں نے کی تھی لیکن وہ بے سود ثابت ہوئی۔ جن لوگوں نے ڈوگرہ سرکار سے اخبار نکالنے کی بارہا اجازت مانگی تھی۔ ان میں گوپی ناتھ گورٹو، منشی محمد دین فوق، سالگ رام سالک اور لالہ ملک راج صراف خاص اہمیت کے نام ہیں مگر ان میں صرف لالہ ملک راج صراف کو ہی ۱۹۲۴ء کو ''رنبیر'' نکالنے کی اجازت ملی تھی لیکن تب تک بہت ہی دیر ہوئی تھی۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا

ہے کہ جو لوگ بھی کشمیر کی مظلومیت کو ابھارنا چاہتے تھے۔ان سبھی ادیبوں نے کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور، پنجاب اور دلی سے یہ کام کیا جس میں سالگرم سالک نے ہجرت کر کے لاہور سے ''خیر خواہِ کشمیر'' کے نام سے اپنا ہفتہ روزہ جاری کیا۔اس کے علاوہ ان کے بڑے بھائی ہرگوپال خستہ بھی اپنے عہد کے بہت بڑے ادیب و شاعر گزرے ہیں، انہوں نے قیامِ لاہور کے دوران راوی، ریفارمر، خیر خواہِ کشمیر، دیش کی پکار وغیرہ جیسے اخبارات سے وابستہ رہ کر کشمیریوں کے ظلم و جبر کی بہترین عکاسی بھی کی۔

منشی محمد دین فوقؔ نے بھی اپنے زمانے میں ڈوگرہ حکومت کو ایک تفصیلی خط لکھ کر کشمیر میں ایک آزادانہ اخبار نکالنے کی اجازت مانگی لیکن بہت کوششوں کے باوجود ان کو مایوسی حاصل ہوئی۔جس کے بعد انہوں لاہور میں ہی رہ کر اخباروں کے ذریعہ کشمیریوں کی کسمپرسی کی عکاسی کی۔محمد دین فوقؔ نے اپنی ساری زندگی میں کشمیریوں کے لیے لکھا۔وہ ریاست کے بہت بڑے محسنین میں شمار ہوتے ہیں۔لاہور سے اس نے جو اخبارات شائع کیے ان میں پنجہ فولاد ۱۹۰۱ء اور کشمیری میگزین ۱۹۱۶ء میں نکالے لیکن کشمیری میگزین کو بعد میں ہفتہ وار کیا اور ''اخبارِ کشمیر'' نام رکھا۔اس کے علاوہ اس اخبار میں کشمیر اور اہل کشمیر کی دلچسپی اور مفاد کی تمام تر خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔لیکن کشمیر کی صحافت پر کشمیر کے مشہور صحافی اور ادیب غلام نبی خیال کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا آغاز دراصل گزشتہ صدی کے تیسری اور چوتھی دہائی میں ایک لازمی ردِ عمل کے طور پر اس وقت ہوا جب ہندوستان کے بہت بڑے ثقافتی مرکز لاہور سے کئی روزنامے اردو دنیا میں اپنی دھاک بٹھا رہے تھے اور ان کے تشہیری عمل میں کشمیر میں شخصی راج کے خلاف عوامی تحریک کی مقبولیت کی

حمایت کرنا ایک بنیادی مقصد تھا۔"!!

اس سب کے علاوہ بہت سے لوگ جو اُردو دنیا کے مایہ ناز ستارے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبارات کے ذریعہ تحریک حریت کشمیر کی ترجمانی کی اور کشمیر کی مستقل آزادی کے حق میں پُر جوش اور با اثر مضامین، مقالات اور منظومات تحریر کیں جن سے ہر ایک فکر و ذہن متاثر ہوا۔ ان اُدیبوں اور صحافیوں میں خاص کر مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، محمد دین فوقؔ، چراغ حسن حسرت اور شورشِ کشمیری خاص اولیت کے حامل ہیں۔

جب جموں و کشمیر میں پرتاپ سنگھ نے حکومت کی عنان کو سنبھالا تو انھوں نے نظم و نسق کو اعلیٰ پایہ اور بہتر طریقے سے چلانے کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کو متعین کیا۔ اس کے لیے انہوں نے پنجاب سے ایسی شخصیات کو بلوایا جو نظم و نسق اور علم و ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان میں خاص کر خواجہ خوشی محمد ناظرؔ اور پیرزادہ محمد حسین عارفؔ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں اصحاب اردو کے بہترین شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کی تعیناتی سے اردو شعر و سخن کو نکھرنے اور ترقی کرنے میں بہت مدد ملی۔

جموں کشمیر میں اردو ادب کی شروعات سب سے پہلے صوبہ جموں سے ہوئی جب بیسوی صدی کے پہلے دہے یعنی ۱۹۰۹ء میں شعر و سخن رکھنے والے چند لوگوں نے بزمِ سخن کی بنیاد رکھی جن میں مرزا مبارک بیگ اور غلام حیدر چشتی وغیرہ قابلِ احترام شخصیات ہیں۔ بزم کی محفلیں ہفتہ وار سجتی تھیں۔ ان محفلوں میں تمام لوگوں کو بالعموم اور شعراء کو بالخصوص دعوت دی جاتی تھی۔ ان ہی محفلوں نے عام لوگوں کو اردو کی مٹھاس سے روشناس کیا اور یہ محفلیں ۱۹۴۷ء کے اواخر تک جاری رہی۔ ان محفلوں کو اردو ادب میں اتنی شہرت ملی کہ اردو کے بڑے بڑے ادیبوں نے ان محفلوں میں شرکت کو باعثِ فخر سمجھا۔ ان ادیبوں میں یگانہ

یاس چنگیزی، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، سیماب اکبر آبادی، عابد علی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، اثر لکھنوی اور فیض احمد فیض قابلِ ذکر ہیں۔ ان ادبی محفلوں کی رونق کو دیکھتے ہوئے ان کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ کشمیر تک پھیل گیا۔ شعر وسخن کی اس محفل کا نام جو جموں وکشمیر میں بنائی گئی ''بزم ادب جموں وکشمیر'' رکھا گیا۔ جس کو کشمیر میں کافی سراہا گیا۔ اور ان محفلوں نے ادب کے لیے لوگوں کے شوق کو اور زیادہ ابھارا۔ اس بزم کے صدر دینا ناتھ چکن مست تھے۔ انجمن کی کارروائیوں میں کشمیر کے پنڈت رہنما اور بے باک صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز، یوسف خان وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اس محفل کا پہلا مشاعرہ مشن اسکول سری نگر میں منعقد ہوا۔ اس کا یادگاری جلسہ ۱۹۳۹ء کو سری نگر کے معروف کالج سری پرتاپ کالج سری نگر میں منعقد ہوا، جس میں ملک کے نامور ادیب، صحافی، محقق اور ناقد موجود تھے۔ جن میں ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر امر ناتھ جھا وغیرہ خاص نام شامل تھے اور اس کی صدارت شری تیج بہادر سپرو نے کی جو اس وقت انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے۔

مذہبی مجلسوں، تقریروں اور خاص کر محرم کی مجالس نے بھی جموں وکشمیر میں اردو ادب کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ ادبی انجمنیں مختلف تقریبوں کا انعقاد کرتی تھی اور شعرا کو بھی مرثیہ نگاری کے لیے مدعو بھی کیا جاتا تھا۔ چونکہ ان مرثیوں میں مذہبی اثر ہوتا تھا تو لوگوں میں شعر وشاعری کی طرف اور زیادہ رجحان بڑھ گیا اور اس طرح ریاست میں اردو ادب کو وسعت ملتی رہی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی کشمیری عوام میں ایک قسم کی سیاسی بیداری آچکی تھی۔ اس بیداری کے پیچھے ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کا سانحہ تھا۔ جب لوگ سرینگر کے سینٹرل جیل کے باہر ایک خاص عدالتی کارروائی کو سننے کے لیے جمع ہوئے تو ڈوگرہ حکومت بوکھلاہٹ کی

شکار ہوئی اور اس نے عام لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلا کر سینکڑوں افراد کو ابدی نیند سلا دیا۔ اس واقعے نے نہ صرف کشمیر کے لوگوں کو تحریک آزادی کے لیے تیار کیا بلکہ کشمیر کے علاوہ برصغیر کے تمام ادیبوں نے اس واقعے کو اپنے اشعار اور مضامین کے علاوہ ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جس سے عام لوگوں میں اردو پڑھنے کے شوق کو پروان چڑھایا، بلکہ اخبارات سے بھی مکمل پابندی ہٹا دی گئی کیونکہ ۱۹۳۱ء تک صرف ایک اخبار ''رنبیر'' جموں سے نکلتا تھا جو لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد ''ہمدرد'' ''خدمت'' ''وتستا'' ''مارتنڈ'' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد ان اخبارات نے کھل کر لوگوں کو آزادی کی ضرورت، افادیت، اہمیت سمجھائی اور آخر میں یہی ایک وجہ بنی جس سے کشمیر کو ڈوگرہ حکومت کے ظلم سے نجات ملی۔

اگرچہ اس کے علاوہ مختلف قسم کی انجمنوں نے بھی شعر و ادب اور مختلف قسم کی تقاریب سے لوگوں کو ڈوگرہ حکومت کے ظلم سے آشنا کرایا۔ اس سلسلے میں مختلف ادیبوں نے اپنے تخلیقی اظہار میں لوگوں کی ترجمانی کی۔ مثلاً پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ڈوگرہ حکومت کے ظلم کو پورے برصغیر کے ادبی حلقوں تک پہنچایا۔ مزید براں انہوں نے مختلف قسم کے ڈرامے لکھے جو بلواسطہ یا بلاواسطہ ڈوگرہ حکومت کے خلاف تھے۔ ان افسانوں اور ڈراموں کو لوگوں نے بہت پسند بھی کیا۔ اس کے علاوہ عبدالاحد آزاد اور مجہور نے بھی اپنی اپنی نظموں کا موضوع کشمیر کی پسماندگی اور لاچاری کو بنایا اور اسے کھل کر بیان کیا۔ اگرچہ ان ادیبوں کو کافی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اردو کی ترویج میں سیدین کمیٹی کا بھی بہت اہم رول رہا۔ جس کے بارے میں ریاست کے مشہور ادیب و محقق محمد یوسف ٹینگ رقمطراز ہیں:

''کشمیر میں اردو کی تدریس کے لیے ۱۹۴۰ء کا سال تاریخی اہمیت

کا حامل ہے اسی سال حکومت نے سیدین کمیٹی (خواجہ غلام سیدین سابق ناظم تعلیمات جموں وکشمیر) کی سفارشات منظور کرتے ہوئے ریاست کے اسکولوں کے لیے آسان اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ لیکن اس سے فارسی یا دیوناگری کسی بھی رسم الخط میں لکھنے پڑھنے کی آزادی دے دی گئی اسی سال تمام اسکولوں اور کالجوں میں اردو سکھانے کے لیے خاص اساتذہ تعینات کیے گئے اور کم وبیش یہی پالیسی آج تک رائج ہے۔ کشمیر میں اردو کے سلسلے میں ۱۹۵۶ء کا سال نہایت اہمیت کا حامل ہے اسی سال ریاست جموں وکشمیر کی پہلی آزاد آئین ساز اسمبلی نے جو آئین منظور کیا اس میں دفعہ ۱۴۵ کے تحت اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔'' [۱۲]

اگرچہ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اردو زبان کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھتے ہوئے پہلے ہی ۱۸۸۹ء کو سرکاری زبان کے بطور درجہ دیا تھا۔



حوالہ جات

۱: جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما...... برج پریمی۔ص ۱۸
۲: تعلیل وتعاویل...... پروفیسر ظہور الدین۔ص ۳۱۸۔۳۱۷
۳: جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما...... برج پریمی۔ص ۲۰
۴: کشمیر میں اردو (جلد اول)...... پروفیسر عبدالقادر سروری۔ص ۸۸

۵: کشمیر میں اردو (جلد دوئم) ...... پروفیسر عبدالقادر سروری۔ص ۱۴۱-۱۴۲

۶: ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب ...... پروفیسر حامدی کاشمیری۔ص ۵۷

۷: کشمیر میں اردو (جلد اول) ...... پروفیسر عبدالقادر سروری۔ص ۲

۸: ہسٹری ...... فیڈرک ڈریو ...... ص ۶۲۰

۹: ریاست میں فارسی زبان کا ارتقاء ...... اننت رام، ص ۴۷

۱۰: جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما ...... برج پریمی۔ص ۵۶

۱۱: خیالات ...... غلام نبی خیال ص ۱۰۱

۱۲: اردو نمبر، ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی ...... سال اشاعت: اگست؛ ۱۹۷۳ص: ۸۰



ریاست کا پہلا افسانہ نگار کون؟

پریم ناتھ پردیسی مسلمہ طور پر ریاست جموں وکشمیر کے مایہ ناز اور سب سے پہلے افسانہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں جنھوں نے شعر گوئی کے ساتھ ساتھ نثری اصناف ، جن میں افسانہ ، ڈراما ، رپورتاژ ، مقالہ ، ناول اور اطفالِ ادب وغیرہ میں بے حد دلچسپ انداز میں طبع آزمائی کی ۔ انھوں نے اردو کے علاوہ کشمیری میں بھی لکھا لیکن بہت کم لکھا۔

پریم ناتھ پردیسؔی ریاست جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری کے مشعل بردار اور امام تصوّر کیے جاتے ہیں ۔ ہندوستان میں جب ترقی پسند تحریک کے بانی سید سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک کا پہلا افسانوی مجموعہ ''انگارے'' شائع کیا تو پردیسؔی نے بھی اپنی زندگی کا پہلا افسانہ تحریر کیا اور ریاست کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اگرچہ بعض محققین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ پریم ناتھ پردیسؔی ہی ریاست کے پہلے افسانہ نگار تھے یا کوئی اور۔ اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے میں نے تقریباً ایک درجن کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن واضح بات کسی مصنف یا محقق نے نہیں لکھی ہے ۔ حامدی کاشمیری، عبدالقادر سروریؔ، برج پریمی ، حبیب کیفوی وغیرہ ایسے محققین ہیں جنھوں نے کوئی ایک رائے قائم نہیں کی ہے۔ بیشتر محققین کی رائے میں پریم ناتھ پردیسؔی نے ہی باضابطہ طور پر افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ پروفیسر سروریؔ اور برج پریمی کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے

کہ ان کو اپنے ہی لکھے ہوئے اقوال میں اختلاف ہے۔ مثلاً برج پریمی اپنی ایک کتاب میں ایک جگہ تیرتھ کشمیری، دوسری جگہ محمد دین فوقؔ اور پھر تیسری جگہ پریم ناتھ پردیسیؔ کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ یہی حال سروریؔ کا بھی ہے کہ ایک جگہ وہ تیرتھ کاشمیری کو پہلا افسانہ نگار گردانتے ہیں تو دوسری جگہ پریم ناتھ پردیسیؔ کو۔

پروفیسر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں اس معاملے پر روشنی ڈالتے ہیں:

> ''پریم ناتھ پردیسیؔ نے افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصی مقام حاصل کرلیا لیکن ان سے کچھ پہلے ہی پنڈت شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری کے نام سے لکھتے رہے اور کشمیر میں اور کشمیر سے باہر ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی''۔[1]

اس طرح سروریؔ صاحب شیام لال ولی کو کشمیر کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں لیکن ان کا کوئی بھی افسانوی مجموعہ شائع ہی نہیں ہوا تھا البتہ غیر مستند روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے افسانے مقامی اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ تیرتھ کاشمیری نے صرف چند افسانے، کچھ ڈرامے اور کچھ مضامین لکھے، جو ہفتہ وار اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔

جموں وکشمیر میں اردو افسانہ کی صنف کی شروعات کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی اپنی ایک کتاب ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'' میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''ریاست میں اردو افسانہ کی طرف سب سے پہلے مورخ، ادیب شاعر اور صحافی منشی محمد دین فوقؔ نے توجہ دلائی۔ اگرچہ فوق نے زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا لیکن ان کے کشمیریت کے جذبے کے بارے میں دورائیں نہیں ہوسکتی۔ فوق نے روشِ زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلمبند کیے جنہیں ہم ریاست جموں وکشمیر

میں اردو افسانہ نگاری کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں''۔[2]

اسی کتاب کے اگلے صفحے پر برج پریمی لکھتے ہیں:

''فوق کے بعد چراغ حسن حسرتؔ کا نام لیا جا سکتا ہے ان کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔ تاریخ، دینیات، صحافت، شاعری، افسانہ وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی اور افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا''۔[3]

برج پریمی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چراغ حسن حسرت ہی فوق کے بعد افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں لیکن برج پریمی کو ''کیلے کا چھلکا'' کہاں سے ملا۔ اس کا کوئی ثبوت آج تک نہیں مل سکا۔ برج پریمی اپنی دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

''پردیسی کشمیر کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز انیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آغاز میں کیا تھا''۔[4]

برج پریمی کے اس حوالے سے خود ان کی کتاب کے مستند حوالے منسوخ ہوتے دیکھائی دے رہے ہیں، اگر اس کتاب کو مدنظر رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پریم ناتھ پردیسی ہی جموں و کشمیر کے پہلے اردو افسانہ نگار ہیں۔ آج بھی کشمیر کے محققین و ناقدین کے لیے یہ ایک قابل بحث موضوع ہے۔ اگرچہ ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء میں اس موضوع پر بہت بحث بھی ہوئی لیکن اہم رسائل اور کتابوں کی عدم دستیابی سے یہ بحث التوا میں پڑ گئی۔

''پریم ناتھ پردیسی عہد ساز شخص اور فنکار'' میں اگرچہ برج پریمی خود پردیسی کو کشمیر کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسری کتاب میں وہ ڈاکٹر عبدالقادر سروریؔ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سروری مرحوم جب ریاستِ جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری پر بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کے سر پر اولیت کا تاج رکھا اور چراغ حسن حسرت کا نام بھول جاتے ہیں جن کا افسانوی مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' اور دیگر افسانے بہت پہلے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے تھے'' ۵

ان سبھی مشاہدات کو مدنظر رکھ کر اندازا ہوتا ہے کہ عبدالقادر سروری اور برج پریمی دونوں خود تضاد کے شکار نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ دونوں کوئی واضح نظریہ سامنے رکھنے میں ناکام ہوتے ہیں اور ہمارے لیے بھی کوئی واضح نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چراغ حسن حسرت کے متعلق محمد دین فوق اپنی مشہور کتاب ''تاریخ اقوام پونچھ'' میں لکھتے ہیں:

''اخباری دنیا میں آپ (چراغ حسن حسرت) ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن اصلیت یہ ہے کہ آپ ایک قابل مصنف اور ایک بے بدل شاعر ہیں۔ کتابیں آپ نے بہت لکھیں اور تقریباً ہر مضمون پر لکھیں۔ لیکن اپنے نام سے کوئی کتاب شائع نہیں کی'' ۶

اس بیان سے برج پریمی کا یہ کہنا کہ ''کیلے کا چھلکا'' چراغ حسن حسرت کا افسانوی مجموعہ ہے غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ محمد دین فوق نے یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں لکھی تھی۔ برج پریمی کے علاوہ کسی محقق نے ''کیلے کا چھلکا'' کے بارے میں نہیں لکھا ہے اور بسیار تلاش کے بعد بھی ایسا کوئی مجموعہ میری نظروں سے نہیں گذرا لیکن پھر بھی تحقیق کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کبھی اس حقیقت سے پردہ اٹھ جائے۔

کشمیر کے نوجوان قلمکار سلیم سالک اس بارے میں اپنی ترتیب دی ہوئی کتاب ''جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک'' میں اس بات کی

وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر برج پریمی کی دلیلوں کو مدِ نظر رکھ کر جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ اس طرح سے ہیں:

(۱) ریاست کی پہلی نثری کتاب ہرگوپال خستہ کی ''گلدستۂ کشمیر'' ۱۸۸۳ء میں لاہور میں شائع ہوئی۔

(۲) ریاست کی پہلی داستان سالگرام سالک کی ''جگت روپ'' ہے جو اشاعت پذیر نہیں ہو سکی۔

(۳) ریاست کا پہلا ناول ''انارکلی''، منشی محمد دین فوق نے ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔

(۴) ریاست کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اس سوال کے جواب میں مثلث قائم ہوتا ہے۔

جس میں تیرتھ کاشمیری، چراغ حسن حسرت اور پریم ناتھ پردیسی کے نام ابھرتے ہیں'' ۷

وادی کشمیر کے نامور افسانہ نگار اور مصنف نور شاہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''آج بھی جب ہم کشمیر میں اردو افسانہ کی بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کا نام سامنے آتا ہے، کیونکہ ریاست میں اردو افسانے کی ابتداء پردیسی سے ہی ہوتی ہے۔'' ۸

ان تمام حوالوں اور کتابوں کے مطالعے سے اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم ناتھ پردیسی ہی جموں و کشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں لیکن متفقہ طور پر یہ بات کہنا شاید قبل از وقت ہی ہوگا۔ اسکے برعکس پریم ناتھ پردیسی شاعری ترک کر کے افسانہ کو ترجیح دیتے ہیں

اوران کے افسانوں میں فنی اور ہیئتی عناصر کا بھرپور شعور ملتا ہے۔ انہوں نے شخصی راج کے ساتھ ساتھ زندگی کے اہم مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اسی لیے پریم ناتھ پردیسی کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ریاست کے اردو افسانے کے موضوع پر ابھی تک کوئی مستند کام نہیں کیا گیا ہے شاید آگے ایسا ہو جائے۔



حوالہ جات

۱: کشمیر میں اردو (جلد دوئم)...... پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ص ۴۴۱

۲: جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما...... برج پریمی۔ ص ۲۷

۳: جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما...... برج پریمی۔ ص ۲۸

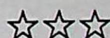
۴: پریم ناتھ پردیسی۔ عہد، شخص اور فنکار...... برج پریمی۔ ۸۴

۵: برج پریمی ایک مطالعہ: پریمی رومانی......ص۔ ۱۳۵

۶: تاریخ اقوام پونچھ...... محمد دین فوق، ص ۶۱۶

۷: جموں و کشمیر کے منتخب اردو افسانے...... سلیم سالک ص ۱۰

۸: جموں و کشمیر کے افسانہ نگار..... تعارف، فن اور مکالمہ، نور شاہ ص۔ ۲۱



پردیسی: شخصیت کے بعض اہم پہلو

آباءواجداد:

کشمیر کے دارالاخلافہ سری نگر کے فتح کدل علاقے میں پریم ناتھ پردیسی کا خاندان قریباً دوسوسالوں تک رہائش پذیر رہا، جو ''سادھو خاندان'' کے نام سے مشہور تھا۔ پردیسی کے جدِ امجد پنڈت سہج کول سادھو تھے۔ان کے بارے میں عام لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ریاست کے کسی گورنر کے معتمد عام رہ چکے تھے اوران کی اصلی قیام گاہ ''بڑی یارحبہ کدل'' میں واقع تھی۔اس بارے میں برج پریمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''پردیسی کے اجداد کی اصلی قیام گاہ بڑی یارحبہ کدل میں تھی جسے آج تک روپ سنگھ کی حویلی کہا جاتا ہے''۔[1]

چونکہ سہج کول سادھو نے جاگیر دارانہ نظام کے تحت بہت سی اراضی حاصل کیں اور ان پر کئی حویلیاں بنائی۔ سہج کول سادھو کا ایک بیٹا تھا، جس کا نام مکند کول تھا۔ مکند کول سادھو پیشے سے تحصیل داراور اپنے زمانے کے بہت اچھے فارسی کے عالم بھی مانے جاتے تھے۔ مکند کول کو فارسی اور اردو پر عبور حاصل تھا اور ہمیشہ اپنے گھر پر علم وداب کی محفلیں منعقد کرتا تھا۔ پردیسی کی زندگی میں مکند کول کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔مکند کول پردیسی کے دادا تھے اورانہوں نے پردیسی کی علمی پرورش وپرداخت کی۔ مکند کول کے کل ملا کر دو بیویوں سے آٹھ اولادیں

تھیں، جن میں مہادیو کول کا نمبر پانچواں تھا۔ پہلی بیوی سے اس کے چھ بچّے تھے اور دوسری بیوی سے دو بچے تھے۔ اس زمانے میں کشمیر کے سیاسی حالات بدلنے لگے اور افلاس و ناداری نے اپنا منھ دکھانا شروع کیا تھا اور جو زمین اور جاگیر اپنے دادا کے وقت حاصل کی تھی وہ آہستہ آہستہ ہاتھ سے نکل رہی تھی، یہاں تک کہ مکند کول کی اولاد کو پیٹ بھرنے کے لیے معمولی ملازمتوں کا سہارا لینا پڑا اور اپنے لیے الگ جائے پناہ تلاش کرنا پڑی۔ مہادیو کول کی تعلیم واجبی تھی۔ وہ انسداد سیلاب کاری وڈر پینچ میں ملازم ہو گئے۔ یہ محکمہ عارضی نوعیت کا تھا اس لیے ان کو سبکدوش کیا گیا۔ خود مہادیو کول کی کئی اولادیں پیدا ہوئیں، مگر سوائے ''مدھوسودن'' کے کوئی بھی بچہ زندہ نہ رہ سکا، جس کا مہادیو کول کو بہت قلق تھا۔ اسی لئے ''مدھوسودن'' کو لاڈ پیار سے پالا گیا اور گھر میں سب پیار سے ''مدھ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ کس کو معلوم تھا کہ آگے چل کر یہی بچہ پریم ناتھ پردیسی کی شکل میں نمودار ہوگا۔ یہ سب معلومات راقم الحروف نے سرینگر میونسپلٹی سے حاصل کیں۔ جہاں سے ''سادھو خاندان'' کا مذکورہ شجرہ نسب دستیاب ہوا۔

شجرۂ نسب سادھو خاندان

پنڈت سہج کول سادھو

پنڈت مکند کول

نیلہ جو	شوبھر دید	کیشو ناتھ قلہ	شیام لال
آنند جو	رانم دید	مہادیو کول	گوشہ لال

مدھوسودھن

(پریم ناتھ پردیسی)

سوم ناتھ سادھو — راجا — شیلا — نسی — ایس کے سادھو

(سری نگر میونسپلٹی فائل نمبر ۲۳) ۲

پیدائش:

پریم ناتھ پردیسی ۱۰/اپریل ۱۹۰۹ء، صبح کے تقریباً ۶ بجے مہادیو کول کے گھر میں پیدا ہوئے۔ پردیسی کا جنم اس لحاظ سے بہت اہم تھا کیونکہ مہادیو کول کی کئی اولادیں پیدا ہوئیں، مگر سوائے پردیسی کے کوئی بھی بچہ زندہ نہ رہ سکا۔ گھر والوں نے پردیسی کا نام ''مدھ'' رکھا جبکہ اسکول ریکارڈ میں ''پریم ناتھ'' لکھا گیا۔ اور بعد میں یہی نام پریم ناتھ پردیسی کے نام سے بہت مشہور ہوا۔ لیکن میونسپل ریکارڈ کے مطابق پردیسی کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۰ء رقم ہے۲ اور اس طرح پردیسی کے جنم سے مشترکہ خاندان میں بے انتہا خوشیاں لوٹ آئیں اور آگے چل کر اس بچے نے کشمیر میں افسانہ نگاری کا باضابطہ آغاز کیا اور کشمیریوں کی افلاس زدہ زندگی کو بہت ہی فنکارانہ انداز میں اردو جاننے والوں کے سامنے پیش کیا۔

بچپن، تعلیم و تربیت:

پردیسی کے جنم سے پہلے ہی ان کے خاندان پر غریبی اور افلاس کے بادل منڈلا رہے تھے لیکن اس کے باوجود اُن کا بچپن بے حد نفیس اور اعلیٰ گذرا۔ اگرچہ پردیسی نے اپنے والد کا تذکرہ زیادہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود تحقیق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد مہادیو کول خود بھی علم و ادب سے کافی دلچسپی رکھتے تھے لیکن زندگی کے مصائب نے ان کو کبھی سر اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ ایک طرف اولادوں کی بے وقت موت اور دوسری طرف عارضی ملازمت سے سبکدوشی نے ان کے اندر کے ادیب کو پنپنے نہ دیا، لیکن اس کے باوجود یہ سارے خواب انہوں نے اپنے بیٹے پردیسی کے لیے سجا کے رکھے تھے۔ بچپن میں ان کی پرورش ان کے دادا مکند کول نے کی۔ مکند کول سے ہی پردیسی کو شعر و شاعری اور افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ مکند کول اپنے گھر میں غیر رسمی طور پر مختلف ادبی محفلیں

سجاتے تھے۔اس بارے میں پردیسی خود لکھتے ہیں:

"لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء سے ہی تھا، خاص کر طبیعت اردو زبان کی طرف بے حد مائل تھی۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میرے دادا جان جو اپنے وقت کے عالم مانے جاتے تھے، اپنے گھر میں ہی ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ سارے شہر کے ادب نواز بزرگ اور سخن فہم حضرات ان میں حصہ لیتے تھے اور گرما گرم بحثیں چھڑ جاتی تھیں، کبھی مولانا حسن نظامی کے مضامین پر، کبھی چکبست کی قومی شاعری پر، کبھی منشی پریم چند کے افسانوں پر اور کبھی مولانا حالی کی نیچرل شاعری زیر بحث رہتی۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا اور دادا جان کی چلم پر آگ رکھنے کی ڈیوٹی میری ذمہ رکھی گئی تھی۔ میں ایک کونے میں بیٹھا ان بزرگوں کی بحثیں توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا اور متاثر ہوا کرتا تھا"[۳]

اس سوانحی مضمون سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ پریم ناتھ پردیسی ان ہی محفلوں سے پروان چڑھتے رہے لیکن یہ سلسلہ محدود مدت تک رہا کیونکہ مکند کول کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔اس کے بعد والد نے پردیسی کو ننیہال روانہ کیا۔ چونکہ پردیسی کا ننیہال آسودہ حال گھرانہ تھا۔ جہاں پردیسی کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔اس طرح پردیسی کو سرکاری ہائی اسکول (آج اس اسکول کا نام اسٹیٹ اسکول ہے) داخل کرایا گیا لیکن ننیہال میں ماما جی کے کہنے پر اسکول ریکارڈ میں پریم ناتھ درج کیا گیا۔ میٹرک کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے ایس پی کالج میں داخلہ تو لیا لیکن یہاں قسمت نے پردیسی کا ساتھ نہیں دیا کیونکہ ان کے والد کا انتقال ہوا اور انہیں کالج کی تعلیم کو ادھورا چھوڑنا پڑا اور گھر کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ اگر چہ ادھوری تعلیم کا غم اور

دُکھ پردیسی کو عمر بھر ستاتا رہا لیکن کیا کرتے غریبی اس قدر تھی کہ ان کو اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔

شادی:

جب پردیسی نے باغ دلاور خان کے سرکاری ہائی اسکول ہا؎ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو والد کی طبیعت بگڑتی رہی۔ جس کے نتیجے میں مہادیوکول نے یہ فیصلہ لیا کہ اب پردیسی کی شادی کا انتظام کیا جائے۔ کافی اصرار کے بعد پردیسی کو گھوسانی خاندان، جو کشمیر میں تجارت کے لیے کافی مشہور تھا، کی شیوجی گھوسانی کی بیٹی کملاوتی کے ساتھ شادی ہونا طے پائی۔ شریمتی کملاوتی انتہائی شوہر پرست، وفا شعار، نیک سیرت اور شریف النفس خاتون تھی، جنہوں نے ہمیشہ پردیسی کی زندگی میں رنگ بھر دیے۔ پردیسی کی زندگی کو ہمیشہ شاداں دیکھا۔ کملاوتی کا خواب تھا کہ اس کے بچوں کی تعلیم وتربیت بہترین طریقے پر ہو۔ جس کو پردیسی نے کماحقہ پورا کیا۔ خود پردیسی ایک ذمہ دار شوہر تھے اور شفیق باپ بھی تھے۔ پردیسی کے انتقال کے ۵۱ سال بعد ۱۳/ اپریل ۲۰۰۶ء کو دلی میں اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر میں شریمتی کملاوتی کا انتقال ہوا۔

اولاد:

پریم ناتھ پردیسی اور شریمتی کملاوتی کو قدرت نے اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔ انہیں دو بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے پہلے بیٹے سومناتھ سادھو کا جنم ۵/ اگست ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد پردیسی کے گھر میں ایک لڑکی نے جنم لیا، جس کا نام شیلا رکھا گیا۔ اس کے بعد پردیسی کے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ایس کے سادھو رکھا گیا۔ پھر متواتر دو لڑکیوں نے پردیسی کے گھر کو منور کیا جن کا نام نِنسی اور راجہ رکھا گیا۔ سومناتھ سادھو کے علاوہ پردیسی کے سبھی بچے دہلی میں ہی مقیم ہیں۔ ان تمام اولادوں میں

صرف سومناتھ سادھو ہی علم وداب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ یوں تو وہ بچپن سے ''پھول'' اور ''آج کل'' میں بچوں کی کہانیاں لکھتے تھے لیکن والد کے ڈر سے وہ کبھی اپنے ادبی خیالات کا اظہار نہیں کر سکے۔ اس بات کا ثبوت ہمیں ان کے ایک خط سے ملا جو انہوں نے موتی لال ساقی کو لکھا تھا، خط میں سومناتھ سادھو اس طرح لکھتے ہیں:

''اپنی زندگی کا حال کیا لکھوں یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے پتا جی مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میں مسخرہ بن کے رہ گیا'' ۵

چونکہ پردیسی خود ادب کے خارزار سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے سومناتھ سادھو کو سائنس کی راہ پر گامزن کیا، مگر عین اسی وقت جب سومناتھ سادھو نے بی ایس سی مکمل کیا تو پردیسی کا انتقال ہوا اور گھر کے سربراہ کی حیثیت سے تعلیم ادھوری ہی چھوڑنا پڑی۔ سادھو صاحب نے ۱۹۵۵ء میں ریڈیو کی ملازمت اختیار کی اور یہ سومناتھ سادھو کا کمالِ فن ہی تھا کہ انہوں نے بہت جلد ادبی روش اپنا کر کشمیری اور اردو ادب میں ایک بلند مقام حاصل کیا لیکن والدِ محترم کی طرح آپ کو بھی ایک مہلک مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ ۵/اکتوبر ۱۹۸۲ء کو دہلی میں اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔

پردیسی کے چھوٹے بیٹے، جس کا نام شیبھن ناتھ سادھو کول ہے۔ وہ بھی پہلے دور درشن سرینگر میں کام کرتے تھے اور بعد میں نامساعد حالات نے ان کو دہلی منتقل ہونے پر مجبور کیا۔ آج کل وہ ریٹائر ہے اور دہلی میں ہی رہائش پذیر ہے۔ بہت ہی نیک دل اور شریف النفس انسان ہے۔ والد کی موت کے وقت وہ صرف ۱۳/سال کے تھے لیکن والد کی شفیق یادیں ابھی بھی ذہن پر نقش ہیں۔ جن یادوں کو انہوں نے ایک گفتگو کے دوران تازہ کیا۔

ملازمت:

والد کی بے وقت موت نے پردیسی کو تعلیم جاری رکھنے کی قطعی اجازت نہ دی۔ اگرچہ پردیسی کو پڑھائی کا بہت شوق تھا لیکن گھر کی مجبوریوں نے ان کو بے سہارا بنایا اور کالج میں داخل ہوتے ہی تعلیم کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ پردیسی کو کبھی اچھی نوکری نہیں ملی۔ پریم ناتھ بزاز اپنے ایک خط جو انہوں نے برج پریمی کو لکھا تھا، میں رقم طراز ہیں:

> ''وہ پہلے اپنے ماما کے ساتھ منشی گری کرتا تھا اور اس کے بعد اس کو محکمہ کسٹم و اکسائز میں بحیثیت ماحالدار نوکری ملی، جس کو پردیسی نے ۱۹۴۷ء تک نبھایا اور آخر کار اسی محکمہ میں بحیثیت انسپکٹر ریٹائر ہوئے''[۶]

پریم ناتھ پردیسی نے بحیثیت ماحالدار بہت تجربہ حاصل کیا اور اس دوران پردیسی کو آر پار جموں و کشمیر دیکھنے کا پورا موقع ملا۔ جس کا پورا اثر ان کے افسانوں میں بھی ملتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ۱۳ ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو ریڈیو کشمیر میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ جبکہ ان ہی دنوں ریڈیو کشمیر کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔ ریڈیو میں پردیسی نے لگاتار آٹھ سال کام کیا اور آخری وقت تک ریڈیو میں ہی کام کرتے رہے اور اس کام نے پردیسی کو بہت حد تک کمزور کیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ پردیسی پانچ برسوں تک ایک ہی پروگرام روزانہ لکھتے اور نشر کرتے رہے، جس کا نام ''جوابی حملہ'' تھا۔ یہ ایک تشہیری پروگرام تھا جو پاکستانی ریڈیو نشریات کے جواب میں چلایا جا رہا تھا اور اس کام پر پردیسی کو معمور کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کے اوقات میں پردیسی کو لکھنے کا بہت ہی کم وقت ملا۔ اپنی زندگی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''سرینگر میں رہتا ہوں اور سرکاری نوکری کر کے اپنے بال بچوں کا

پیٹ پالتا ہوں۔ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ فراغت کا ایک
لمحہ بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا اس لیے کالج میں داخل ہو کر ہی تعلیم کو
خیر آباد کہنا پڑا اور زندگی کے بھنور میں کودنا پڑا۔ حالانکہ وہ عمر بھنوروں
میں کودنے کی نہیں تھی مگر افلاس اور کم مائیگی کے شدید احساس نے
تمام آرزوؤں کو خاک میں ملایا" [8]

بیماری و انتقال:

اس میں شک نہیں کہ پردیسی کی زندگی میں کبھی بھی سکون اور آرام میسر نہ ہو سکا۔
بچپن کے چند آیام کے بعد کبھی بھی پردیسی نے اچھے حالات نہیں دیکھے۔ کبھی نوکری کے
سلسلے میں جموں کا دورہ کرنا پڑا تو کبھی آزاد کشمیر میں رہنا پڑا۔ جس کی وجہ سے ان کو کبھی آرام
میسر نہ ہو سکا۔ برج پریمی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"پچھلے آیام میں پردیسی ریڈیو بارکوں میں رہتا تھا اور مجھے کئی بار اس
کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا۔ ان کو بلیک موشن جیسا مہلک مرض ہمیشہ
حملہ کرتا تھا۔ اس کو ڈاکٹروں نے کئی بار آپریشن کا مشورہ دیا، لیکن
پردیسی ہر بار نبھائے جا رہے تھے آخری وقت میں ان کو معدے کا
السر ہوا تھا اور پھر اس کو آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔
میں نے اس زمانے میں ان کو اکثر بستر علالت پر ہی لیٹے لیٹے
"جوابی حملہ" لکھتے ہوئے دیکھا ہے" [9]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پردیسی کتنے مہلک مرض میں مبتلا تھے اس کے باوجود
وہ سگریٹ نوشی کے بہت عادی تھے ہمیشہ چھوٹی اور درمیانی انگلی کے درمیان سگریٹ دبائے
رکھتے تھے وہ اس زمانے کے مشہور برانڈ نمبر ۱۰ پیتے تھے۔ اسی سگریٹ نوشی نے پردیسی کے

پرلوک سدھارنے میں اہم رول ادا کیا جبکہ پردیسی نے ہسپتال کے گیٹ تک سگریٹ نوشی کو ترک نہیں کیا۔ دسمبر کے آخری دنوں میں ان کو ماہر ڈاکٹروں نے آپریشن کیا لیکن تب تک مرض نے اپنا تمام کام کرلیا تھا اور آخر کار ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کو وہ رحلت کر گئے۔ ان کی بیماری کے بارے میں جب میں نے ان کے بیٹے سے استفسار کیا تو انہوں نے کہا:

"جب ان کا پہلا آپریشن کیا گیا تو ڈاکٹر آپریشن کے دوران کوئی چیز اندر بھول گئے جس سے پتاجی کو کافی تکلیف ہوتی تھی، پھر دوبارہ آپریشن کرنا پڑا جس سے پتاجی کی موت واقع ہوئی"۔[10]

اس طرح پردیسی جیسی ایک اہم ادبی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی جس پر ماہنامہ "شاہراہ" نئی دہلی نے پردیسی کا فوٹو گراف اور ایک سیاہ حاشیہ بھی چھاپا تھا جس پر ادارے کا نوٹ لکھا ہے کہ:

"پریم ناتھ پردیسی کی افسانہ نگاری ابھی شباب کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی اور انہیں جینے اور بہتر سے بہتر لکھنے کی بڑی تمنائیں تھیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری کا یہ راز پالیا تھا کہ زندگی کے جس گوشے کو اور جن کرداروں کو ان کے درمیان رہ کر، رچ بس کر سمجھا اور پہچانا ہے صرف انہیں کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ آل انڈیا ریڈیو کے سرینگر اسٹیشن پر ملازمت کر رہے تھے۔ دفتر کے بھاری کام سے جیسے جیسے فرصت نکال کر افسانے لکھتے تھے۔ وہ افسانے ہم سے جو تقاضہ کرتے ہیں۔ ہم ان تقاضوں کو پورا کرکے ان کو خراجِ عقیدت پیش کریں"۔[11]

اس طرح کشمیر کے پہلے افسانہ نگار نے خلاق ذہن کا بہترین اظہار کرکے اردو کہانی اور ڈرامے کے توسط سے پہلی بار کشمیری زندگی کی حقیقت آمیز ترجمانی کی تھی۔ اردو

ادب میں اپنے فن کارانہ عرفان سے ایک نئی جہت عطا کی تھی۔ اس بارے میں غلام محمد صادق ''بہتے چراغ'' کے دیباچے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''مجھے امید ہے کہ پردیسی کی بے وقت موت سے ہمارے افسانوی ادب میں جو نقصان واقع ہوا ہے۔ ابھرتے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگار اس کی تلافی کریں گے اور پردیسی اس فن کو جس منزل تک لائے وہ اس کو وہاں سے آگے لے جائیں گے'' [۱۲]

پریم ناتھ پردیسی کی شخصیت:

پریم ناتھ پردیسی ایک بھرپور اور مثالی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ شوہر، باپ، سرکاری ملازم اور سماج کے فرد کی حیثیت سے ایک ذمہ دار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کی گوناگوں خصوصیات سے سب کو متاثر کیا وہ ایک مثالی انسان تھے۔

سراپا:

پردیسی اپنے دورِ شباب میں کافی وجیہ تھے۔ لباس اور وضع قطع کے اعتبار سے سادگی پسند تھے، روشِ زمانہ کے مطابق عرصہ دراز تک سر پر پگڑی باندھتے تھے اور بعد میں ٹوپی کا استعمال کرنے لگے تھے۔ نفاست پسند اور بہت حاضر جواب تھے۔ فقرے کسنے میں جواب نہیں تھا لیکن کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ ان کے ایک ہمعصر ادیب فدا صبوحی نے ایک زمانے میں ان کا قلمی چہرہ لکھا تھا، جس کو روزنامہ چاند جموں نے شائع بھی کیا تھا:

''آپ کا چہرا بڑا گورا مورا اور پیارا پیارا ہے کسی نوخیز حسینہ کے اٹھتے ہوئے شباب کی طرح ابھرے ہے اور سرخ و سپید گال، پتلے پتلے ہونٹ گویا چغتائی آرٹ کا کامیاب تتبع اختر شیرانی کے کسی نوجوان مگر

آوارہ گرد شعر کی طرح چھوٹی اور چمکدار آنکھیں اور ان بجلیوں پر
ایک نازک سی عینک......
سر پر پگڑی باندھتے ہیں لباس سادہ و بے تکلف اور اندازِ گفتگو انتہائی
دلکش کہ ہر بات کو بلائیں لینے کو جی چاہیئے ....ترقی پسند ادب
کے شیدائی اور اعتقاداً کمیونسٹ مگر اپنے آپ کو کامریڈ کہنے میں ذرا
ہچکچاتے ہیں''[۱۳]

لباس:

پریم ناتھ پردیسی کشمیری تہذیب کے علمبردار تھے اور پوری زندگی اسی آن، بان اور شان سے گزاری۔ ان کے لباس سے کشمیری لباس کی عکاسی ہوتی تھی۔ وہ عمدہ قسم کا لباس پہنتے تھے، گھر میں اکثر خاں سوٹ پہنتے تھے اور ملازمت کے دوران پنٹ شرٹ یا پھر کوٹ پہنتے تھے۔ پچھلے آیام میں وہ خان سوٹ کے اوپر کوٹ پہنتے تھے اور موسمِ سرما میں وہ اکثر پھرن (کشمیر کا خاص لباس) کا استعمال کرتے تھے۔ وہ کپڑوں میں ہلکے رنگوں کو پسند کرتے تھے۔ وہ نئے لباس اور گھڑی پہننے کا بہت ہی شوق رکھتے تھے۔ عینک ان کی زندگی کا حصہ تھی جس نے مرنے تک پردیسی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ شادی بیاہ اور خاص مذہبی تقریبات پر پردیسی سفید پگڑی کا خوب استعمال کرتے تھے جو کہ ان دنوں کشمیر کا رواج بھی تھا۔ مختصراً ان کا لباس ہمیشہ نفیس اور صاف ستھرا ہوتا تھا۔

غذا:

پریم ناتھ پردیسی غذا کے معاملے میں دوسرے پنڈتوں سے بالکل مختلف تھے اگرچہ کشمیری پنڈت گھرانوں میں گوشت کا استعمال کم ہی ہوتا ہے لیکن پردیسی گوشت کھانے کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ پردیسی سبزی، گوشت، مچھلی اور سب سے زیادہ مرغا کھانا

بہت پسند کرتے تھے۔ کشمیری مرغا کھانے کے وہ اس حد تک شوقین تھے کہ وہ گھر میں سینکڑوں مرغیوں کو پال رکھا تھا ۔اس کے علاوہ پردیسی کشمیری وازوان (کشمیر کا ایک خاص پکوان جو پوری دنیا میں مشہور ہے) کے بھی بہت شوقین تھے۔اس بارے میں پردیسی کے چھوٹے بیٹے شبھن سادھو کول نے بتایا:

"میرے پتا جی گوشت خور تھے اور ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے لیکن کشمیری مرغوں میں خاصی دلچسپی تھی"[14]

مذہبی عقائد:

پنڈت پریم ناتھ پردیسی کشمیر کے پنڈت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ پنڈت ہندو مذہب کی ایک اعلیٰ قسم تصور کی جاتی ہے لیکن پردیسی مذہب اور ذات پات سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔اگرچہ پردیسی خود کمیونسٹ ذہنیت کے مالک تھے لیکن اپنے آپ کو ہندو کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے لیکن ترقی پسند تحریک نے پوری طرح کمیونزم کی طرف مائل کیا تھا۔

گھریلو زندگی:

پردیسی اپنی اہلیہ کملاوتی گھوسانی اور اپنے بچوں کے ساتھ ذمہ دار انسان کی حیثیت سے رہے۔ذمہ داری کا احساس تو ان کو بچپن ہی میں ہو گیا تھا جبکہ ان کے والد مہادیو کول سادھو کا کم عمری میں ہی انتقال ہو گیا۔اس یتیمی کے داغ نے انہیں ایک فرض شناس انسان بنا دیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی گھریلو زندگی میں ہمیشہ غیر متنازعہ رہے، اپنے بچوں کی جہاں تک ہو سکا بہتر پرورش کی اور اپنے گھر کا پورا خیال رکھتے تھے۔اگرچہ پردیسی مرحوم اپنی ان ذمہ داریوں کو آخری دم تک نبھاتے رہے لیکن موت نے وفا نہ کی اور کم عمری

میں ہی وفات پائی اور وہ پانچ یتیم بچوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چل بسے۔ گھریلو زندگی کے بارے میں جب میں نے ان کے بیٹے شمن سادھو کول سے استفسار کیا تو اس نے کہا:

''میری ماتاجی کہتی تھی کہ پردیسی جیسا ملنسار اور خوش خلق انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا'' ۱۵؎

ادبی دلچسپیاں:

پریم ناتھ پردیسی اپنے دادا جان کی ان محفلوں کو ہی اپنے لیے مشعل راہ مانتے ہیں جوان کے بچپن میں ان کے گھر پر منعقد ہوتی تھی جس میں شہر کے نامور شعراء اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ موجود ہوتے تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد ان کے دادا مکند کول کا انتقال ہوتا ہے اور شعروسخن کی یہ محفلیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس قلیل مدت میں پردیسی نے بہت سی ادبی شخصیتوں کو بہت ہی قریب سے جان لیا تھا اور ساتھ میں چکبست لکھنوی، مولانا الطاف حسین حالی، جوش، پریم چند، ٹیگور اور دوسرے لوگوں کے علم وفن کے بارے میں متعارف ہو چکے تھے۔ ان سب کے ادب نے ان کے دل پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے اور خاص کر منشی پریم چند سے وہ اس حد تک متاثر تھے خود ایک جگہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے آج تک یاد ہے کہ جب ایک صاحب نے منشی پریم چند کی کہانی ''بوڑھی کاکی'' سنائی تو میں ساری رات اس کی بے بسی پر روتا رہا'' ۱۶؎

یہی وہ دور تھا جب منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری کے افسانوں نے پوری ادبی دنیا میں دھوم مچا دی تھی اور خود پریم چند حقیقت پسندی کو ترجیحی بنیادوں پر لکھتے تھے اور ہندوستان میں افسانویت کے مختلف دبستان کام

کرنے لگے۔



حوالہ جات

ا: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۹۱۔۲۰

۲: سری نگر مونسپلٹی۔ فائل نمبر ص ۲۳

۳: ماہنامہ ''فسانہ'' آلہ آباد ۔ص ۸۔۶

(نوٹ: یہ ایک سوانحی خط ہے جو پردیسی نے معروف افسانہ نگار صدیقہ بیگم سیوہاری کو لکھا تھا)۔

۴: ایس کے سادھو کیساتھ راقم کی ایک غیر رسمی ملاقات، ۶ جنوری ۲۰۱۶

۵: ہمارا ادب: شخصیات نمبر، مقالہ نگار: موتی لعل ساقی

۶: مشاہیر ادب کے خطوط۔ برج پریمی کے نام۔ مرتبہ پریمی رومانی۔ص ۹۲۔۹۳

۷: پردیسی کی وہ آڈر کاپی، جو راقم نے پردیسی کے پوتے راجو سادھو سے حاصل کی۔

۸: ماہنامہ ''فسانہ'' آلہ باد، مدیر صدیقہ بیگم سیوہاری۔ص۔۸۔۶

۹: ذوق نظر۔ برج پریمی۔ رچنا پبلیکیشنز، جموں توی۔ص ۳۲

۱۰: یہ انکشاف پردیسی نے بیٹے نے راقم کے ساتھ دوران گفتگو کیا۔

۱۱: ماہنامہ ''شاہراہ'' ۔فروری ۱۹۵۵

۱۲: بہتے چراغ۔ص ۹

۱۳: روزنامہ ''چاند'' جموں۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵

۱۴: ایک انٹرویو: شھبن سادھو کے ساتھ

۱۵: یک انٹرویو: شھبن سادھو کے ساتھ

۱۶: ماہنامہ ''فسانہ'' آلہ آباد۔ص۔۸



پردیسی کی ادب سے وابستگی

پریم ناتھ پردیسی ایک حقیقت نگار تھے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کی شاعری سے کیا اور''رونق'' تخلص اختیار کیا۔شعروشاعری کے اسرار ورموز اپنے دادا جان مکند کول کی محفلوں میں سیکھ لیے تھے۔اقبالؔ وحالیؔ جیسے عظیم شعراء کے اشعار ان کے کانوں میں پڑ چکے تھے اور یوں انہوں نے اشعار کے محاسن ومعائب پر بھی اچھی خاصی قدرت حاصل کرلی تھی۔ان دنوں کشمیر کے سیاسی حالات کافی ابتر ہو چکے تھے۔ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم واستبداد سے عوام کافی پریشان تھی۔عوام کی دادرسی کے لئے اخباروں پر پہلے ہی قدغن لگائی جاچکی تھی۔اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیر کے ایک مایہ ناز سپوت پنڈت گوپی ناتھ گورٹو نے ہجرت کر کے لاہور سے''اخبارِ عام'' کے نام سے ایک ہفتہ روزہ شائع کیا،جو خالص کشمیریوں کے لئے وقف تھا۔جو قلم کار اس اخبار کے لئے خصوصی طور پر اپنے شذرات لکھتے تھے ان میں نند لال طالبؔ،زند کول ثابتؔ،دینا ناتھ مستؔ،دینا ناتھ واریکو شاہدؔ،شام لال تیرتھؔ،شنکر ناتھ صغیر اور شام لال ایمہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اسی اخبار سے پردیسی نے''رونق'' کے تخلص سے اپنی ادبی زندگی کی شروعات بھی کی۔اس کے بعد''پردیسی'' لکھنے لگے اور آخری وقت تک پردیسی نے قلم کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا،خواہ وہ آزاد کشمیر کی نیلم ویلی ہو،جموں کی تپتی گرمی ہو یا پھر کپواڑہ کے جنگلات،

پردیسی جہاں پر بھی رہے، لکھتے رہے اور کشمیر کی بہترین ترجمانی کرتے رہے۔ ہاں اس میں مختلف موڑ ضرور آئے۔ اس دوران کشمیر کے بہت بڑے صحافی لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں ریاست کا پہلا ہفتہ روزہ ''رنبیر'' جموں سے شائع ہونے لگا۔ اس کی اجازت لالہ ملک راج صراف کو بڑی مشکل سے ملی تھی اور یہی اخبار ریاست کا پہلا ہفتہ روزہ اخبار بن گیا۔ پردیسی نے ہمیشہ ''رنبیر'' کو بڑی عقیدت سے یاد کیا اور اپنی تخلیقات میں رنبیر کے اعلیٰ کردار کا ہمیشہ نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ہمیشہ سراہتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کشمیر کے خطے سے پہلا روزنامہ ''وتستا'' جاری کیا تو اس میں بھی پردیسی ''رونق'' کے قلمی نام سے ہی مستقل لکھنے لگے۔

''وتستا'' کے شروعاتی دو سالوں کے بعد ہی پریم ناتھ بزاز نے دوسرا اخبار روزنامہ ''ہمدرد'' جاری کیا۔ پردیسی نہ صرف اس اخبار کے مستقل کالم نویس بن گئے بلکہ پردیسی ''ہمدرد'' کے ادبی معاون بھی رہے۔ اس اخبار نے کشمیر کی سیاسی ترجمانی کی اور بہت ہی کم وقت میں کافی ترقی کی۔ کشمیر کی عملی سیاست اور تحریکِ آزادی میں ایک خاص اور دلچسپ کردار ادا کیا۔

عبث ہے کاتبِ تقدیر سے شکوہ ترا رونق
جہاں عشق میں ان کی نگہہ تقدیر ہوتی ہے

''رونق'' نے اپنی شعر گوئی صرف غزل تک ہی محدود نہیں رکھی بلکہ مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً نظمیں بھی لکھیں۔ اس کے علاوہ نثری نظمیں لکھیں۔ ''رنبیر'' ''میلاپ'' ''کرم ویر'' ''مارتنڈ'' ''ہمدرد'' وغیرہ جیسے بہت سے اخبارات ہیں جن میں پردیسی نے آخری وقت تک ''رونق'' کے تخلص سے ہی شعر کہے، خاص کر تہواروں کے مواقع

پر یا خاص نمبرات کی اجرائی پر، ان کی شاعری کو خصوصی طور پر شائع کیا جاتا تھا۔

پریم ناتھ پردیسی نے ''رونق کشمیری'' ''علامہ علائی'' ''سادھو کاشمیری'' اور بالک رام باری کے فرضی ناموں سے بھی لکھا ہے۔ ان کی تخلیقات برصغیر کے نامور اخبارات، رسائل وجرائد میں شائع ہوتی تھیں لیکن علم وادب کے شیدائی ان کو صرف تین افسانوی مجموعوں کے خالق کی حیثیت سے جانتے ہیں جس میں شام وسحر، دنیا ہماری اور بہتے چراغ شامل ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے قلمی ناموں کے بارے میں عبدالقادر سروری ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''پردیسی کچھ اپنی طبیعت کے تنوع اور کچھ اس زمانے میں دوسرے لکھنے والوں کی روایت کی پابندی میں، کئی ناموں سے لکھتے تھے، چنانچہ ان چار پانچ ناموں کا پتہ چل سکا ہے۔(۱) پریم ناتھ سادھو رونق کشمیری (۲) بابو (۳) علائی (۴) رونق کشمیری (۵) پردیسی کاشمیری''۔[۱]

کشمیر کے مایہ ناز ادیب، سرکردہ ڈرامہ نویس قیصر قلندر پردیسی کے تخلص کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ریڈیو کشمیر کی ملازمت کے دوران ایک دن مجھے پردیسی نے کہا کہ اس نے سب سے پہلے سادھو کاشمیری کے نام سے لکھنا شروع کیا اور بچوں کے لیے ''رتن'' اور ''پھول'' میں مضامین اور کہانیاں چھپواتا تھا تو میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ جس کا جواب اس کے دوسرے

جملے میں تھا' دنیا ایک عارضی قیام گاہ ہے، ایک پڑاؤ ہے، ایک راستہ
ہے جو ہمیں اصلی منزل کا پتہ بتاتی ہے جہاں پہنچ کر ہم دم لیں گے۔
اس دیس میں سب کے سب بدیسی ہیں۔ کیا ہوا گر میں نے حقیقت
کا یوں اظہار کیا ہے اور اپنے نام کے ساتھ 'پردیسی' لکھا ہے''۔[۲]

افسانوی مجموعوں کے علاوہ پردیسی کے بہت اچھے ڈرامے بھی اسٹیج ہوئے ،اگرچہ پردیسی کے ڈرامے ابھی تک کتابی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ پردیسی نے ایک ناول بھی لکھا جس کا نام ''پوتی'' بتایا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب ریڈیو کشمیر کا قیام عمل میں آیا تو پردیسی کو بھی قلمکار ہونے کے ناطے بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ تعینات کیا گیا۔ جہاں وہ آخری دم تک سلسلہ وار ایک پراپگنڈے کا پروگرام لکھتے بھی تھے اور خود ہی پیش بھی کرتے تھے۔

پریم ناتھ پردیسی کا شعور ترقی پسند تحریک کے ماحول میں پروان چڑھ رہا تھا۔ جب پریم چند کے ساتھ ساتھ سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، اعظم کریوی، مجنوں گورکھپوری اور کئی اور افسانہ نگاروں نے نئے تصورات اور امکانات کے ساتھ اردو افسانے کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ اسی دور میں پردیسی نے بھی پہلے شاعری اور پھر رومانی افسانے لکھے لیکن بہت جلد ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر نئے رو۔حجانات کے زیر اثر افسانے تخلیق کئے ،جس کا اعتراف وہ ایک جگہ خود کرتے ہیں:

''جب ترقی پسند مصنفین کی پہلی کتاب ''انگارے'' شائع ہوئی، تو
مجھے شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ جو کچھ آج تک میں نے لکھا
ہے سب بے کار ہے کیونکہ اس میں رومان کے سوا کچھ نہ تھا میں نے

اپنے مطالعے کو وسیع کرنا شروع کیا۔ اور غیر ملکی افسانہ نگاروں کے
علاوہ ہندوستان کے ان نئے افسانہ نگاوں کی چیزیں بھی پڑھتا گیا جو
یک لخت مطلع ادب پر نمودار ہوگئے تھے اور جن کے ہر لفظ سے غصہ
رنج اور بغاوت ٹپکتی تھی۔ سماج کے اس نظام کے خلاف جواب فرسودہ
ہو چکا تھا۔ یہ ایک نئی آواز جو انقلاب روس کے بعد ہندوستان میں
گونج اٹھی اور جس نے سب کو جھنجھوڑا اور بیدار کیا ماسوائے گنتی کے
ان چند ادبائے کرام کے جنہیں اس آواز سے اپنی ریت کی بنیادیں
سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں...... ''[۳]

بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں پہنچتے پہنچے پردیسی کا شعور کافی بیدار ہو چکا تھا۔ پردیسی اب ادب کے وسیع میدان میں آچکے تھے اور وہ ایک باشعور فنکار بن گئے تھے جس کا ثبوت انہوں نے ادبی میدان میں آ کر دے دیا۔ بچپن میں بے فکری کے دنوں میں دادا جان کی جن ادبی محفلوں میں وہ تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔ اب وہ محفلیں کب کی بند ہو چکی تھیں لیکن وہ چنگاری اب شعلہ بن گئی تھی کیونکہ اب ان کے شعر اور نثر ان کے مکمل احساسات کی ترجمانی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے چند دوستوں کی ایما پر ''حلقہ اربابِ ذوق'' کے نام سے ادبی انجمن تشکیل دی۔ کشمیر کے چند نوجوان ادیبوں کا مختصر سا حلقہ قائم ہوا۔ اگرچہ اس کی نشستیں پردیسی کے گھر تک ہی محدود رہی لیکن بعد میں اس تحریک کو آگے بڑھنے میں مرزا عارف بیگ بھی پیش پیش رہے پھر اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا تو یہ ادبی نشستیں ایس پی کالج میں ہونے لگیں اور اس تحریک نے ریاست کے اکثر و بیشتر ادیبوں کو متاثر کیا۔

اس کے بعد دوسرا دورِ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا آیا اور اس میں اپنے وقت کے مشہور فلم ساز اور ہدایت کار و ترقی پسند ادیب رامانند ساگر پردیسی کے بہت قریب آ گئے۔ رامانند ساگر اصل میں گلمرگ کشمیر کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر سے باہر ہی گزرا، جس کی وجہ سے وہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ راما نند ساگر نے ہی پردیسی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی ریاستی شاخ کھولنے پر آمادہ کیا۔ اگرچہ پردیسی اس کام کو انجام دینے کے لئے پہلے ہی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ چونکہ پردیسی کے پاس پہلے ہی حلقہ اربابِ ذوق کا تجربہ بھی تھا اس لیے ان کو یہ کام اپنانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اور اس طرح دونوں (رامانند ساگر اور پردیسی) نے مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی ریاستی شاخ کی بنیاد ڈالی لیکن یہ وہی لوگ تھے جو پردیسی کے گھر میں حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے اب اس انجمن میں سرگرم عمل نظر آتے تھے۔ ان میں مرزا عارف بیگ، دینا ناتھ نادم، پی این پشپ، پریم ناتھ پردیسی، عبدالحق برق، نور محمد روشن، سومناتھ زتشی وغیرہ شامل تھے۔ غلام احمد مہجور، ماسٹر زندہ کول اور عبدالاحد آزاد۔ اُس وقت کشمیر کے تین بڑے شعراء اور ادیب تھے لیکن یہ لوگ انجمن میں شامل نہ تھے پھر بھی یہ اس بزم میں شریک ہوتے تھے اور اپنی رائے سے بھی نوازتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کا دائرہ اثر پھیلتا گیا۔ بیرون کشمیر سے آنے والے ترقی پسند شعراء اور انجمن کے اراکین حضرات بذاتِ خود ان نشستوں میں شریک ہوئے تھے اور نوجوان ادیبوں اور قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے، جن میں راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، دیویندر ناتھ ستیارتھی، جیسی شخصیات بھی آتی تھیں۔ اس طرح سے ترقی پسند مصنفین کی راہ ہموار ہوگئی اور اس کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس چھوٹی سی انجمن کی کارگزاری نے ریاست جموں و کشمیر میں

ایک ہمہ گیرادبی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔خود پریم ناتھ پردیسی اس انجمن کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"حلقہ ارباب ذوق کے بند ہونے کے دو سال بعد رامانند ساگر آ گئے اور آتے ہی مجھ سے ملے۔انہوں نے مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کھولنے کے لیے کہا چونکہ ہم دونوں نے مل کر یہاں کے ترقی پسند ادیبوں کو اکٹھا کیا اور انجمن قائم کی جو آج تک قائم ہے"[4]

ابتداء میں اس انجمن کی نشست ہر مہینے کی یکم تاریخ کو پردیسی کے گھر میں منعقد ہوتی تھی۔مگر رفتہ رفتہ انجمن کا حلقہ وسیع تر ہوتا گیا اور انجمن کی کارکردگی سے ادب نواز لوگ دلچسپی کا اظہار کرنے لگے،تب ٹنڈل بسکو اسکول اور ایس پی کالج میں اس انجمن کے جلسے منعقد ہونے لگے۔انجمن کو منظّم طریقے سے چلانے کے لیے منظّم طریقہ کار اپنانے کی ضرورت پڑی جس کی بنیاد پر انجمن کے مختلف اوقات میں معتمد عام مقرر ہوئے جن میں قیصر قلندر،سوم ناتھ سادھو،علی محمد لون،وغیرہ رہے ہیں اور ان تمام نشستوں کی کارروائی محترم نندلال واتل کے اخبار"نو یگ"میں شائع ہوتی تھیں اور بعد میں ان میں پردیسی کے علاوہ سراج الدین احمد، کنول نین چکر پرواز، محمد ہاشمی، ایس این کول، مہندر رینہ، حمید فطرت،ڈاکٹر نذر اسلام وغیرہ خاص طور پر شریک ہوتے تھے اور یہ انجمن ۱۹۴۸ء تک سرگرم عمل رہی۔

اس دور میں جتنے بھی ادیب واردِ کشمیر ہوئے اس انجمن میں اپنی دلچسپی کا اظہار ضرور کیا کرتے تھے۔ان میں راجندر سنگھ بیدی اور بلراج ساہنی قابل ذکر ہیں اور کبھی کبھی یہ شخصیات اپنی تخلیقات کو بھی انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔رامانند ساگر نے اپنی مشہور

کہانی ''ٹنگمرگ کے اڈے پر'' اور اپنے مشہور ناول ''اور انسان مرگیا'' کو قسط وار انہی نشستوں میں پڑھ کر داد و تحسین حاصل کی تھی۔ پردیسی نے اپنی کئی مشہور کہانیاں بھی ان نشستوں میں سنائیں جس میں ڈوگرہ سرکار کے تانا شاہی نظام کی دھجیاں اڑادی گئی ہیں۔ان کہانیوں میں کتبے، کاغذ کی جھنڈیاں اور جواری وغیرہ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' کی تیسری جلد میں ریاست کی ترقی پسند تحریک کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

''پچھلے عہد میں ادب کی راہیں روایتی تھیں اور دوسری تحریروں کی متحرک ہونے کی ضرورت، لیکن اس دور میں ادب کی راہیں زندگی سے کھولنے کی کوشش شروع ہوئی اور اس سے انفرادی اور اجتماعی اور سماجی تقاضوں کا آئینہ دار بنانے کی کی کوشش کی جانے لگی۔ گو کہ روایت کا پاس اب بھی باقی ہے نئے شعور کا آغاز پریم ناتھ پردیسی سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں ان کے ہم خیال دوستوں نے ترقی پسند ادیبوں کی ایک لیگ قائم کی تھی۔ جس میں رامانند ساگر کی کوششوں کا بہت دخل تھا۔ اور اس میں پریم ناتھ پردیسی کے علاوہ دینا ناتھ نادم، واریکو شاہد، سوم ناتھ زتشی، مرزا غلام حسن بیگ عارف، مہجور، تیرتھ کشمیری، نندلال بے غرض، پرتھوی ناتھ کول، اور نند لال واتل شامل تھے۔ ایک اور سعی ۱۹۴۶ء میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کے قیام کی بھی ہوئی، جس کا ایک شعبہ تھیٹر کا بھی تھا اور اس کے صدر عبدالقادر عاصی تھے، بعد میں یہ حلقہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین

کے ساتھ ضم ہوگیا۔ اس حلقے کے جلسے کبھی پردیسی کے مکان پر اور کبھی
ان کے دوسرے اراکین کی قیام گاہوں پر منعقد ہوتے جن میں
کہانیاں پیش کی جاتیں، غزلیں اور نظمیں سنائی جاتی اور ان پر
تبصرے بھی ہوتے۔ پریم ناتھ بزاز جیسے قلم اور عمل کے قائد بھی کبھی
کبھی ان جلسوں میں شامل ہوتے تھے''۵

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں انگریز سامراج کی شہہ پر پاکستانی قبائلی ہتھیار بند لوگوں نے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ یہ وہ دن تھے جب ڈگرہ شاہی دور اپنے زوال کو پہنچ چکا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی کمزور افواج قبائلیوں کے سامنے بے بس ہوئی اور وہ کشمیر سے بھاگ گئی۔ کشمیر کے مظلوم عوام کو بے دست و پا چھوڑ دیا۔ لیکن اس وقت کے عوامی لیڈر شیخ محمد عبداللہ نے پنڈت جواہر لال نہرو سے مدد مانگ لی اور دراندازوں کو واپس دھکیلا گیا۔ یہ کشمیر کی تاریخ کا انتہائی حساس موڑ تھا۔ جس کے زخم آج بھی معصوم کشمیری عوام کے دلوں پر ثبت ہیں۔ اس صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے بیرونی دفاع کے ساتھ ساتھ اندرونی دفاع اور امن وامان کی بھی ضرورت تھی اور اس کے لیے ایک چھوٹی سی فوج نیشنل ملیشیا (National Malatia) کے نام سے بھی منظم ہوئی۔ جس کی ایک شاخ دانشوروں ادیبوں، شاعروں اور باشعور نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ اس کا نام پھر نیشنل کلچرل فرنٹ رکھا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ اگرچہ خود ترقی پسند نہ تھے لیکن ان کی جماعت (نیشنل کانفرنس) کے جو دوسرے لوگ تھے ان میں اکثریت ترقی پسند سوچ رکھنے والے لوگوں کی تھی۔

محاذ کا ابتدائی دفتر اس وقت کے کارنیشن ہوٹل (موجودہ کشمیری گیسٹ ہاؤس) میں تھا۔ اس ہوٹل میں لوگوں کے بڑے بڑے جلسے منعقد کیے جاتے تھے اور لوگوں کے لہو کو

گرمانے والے نغمے، گیت اور ترانے پیش کیے جاتے تھے۔

اس محاذ سے تعلق رکھنے والے بیشتر ادیبوں، دانشوروں اور شعراء میں بھی ہتھیار تقسیم کیے گئے اور ان کو باضابطہ تربیت دی جاتی تھی یہی وہ لوگ تھے جو راتوں کو بندوق اٹھا کر لوگوں کی حفاظت کرتے تھے اور دن کو تڑپانے والے نغمے تخلیق کرتے تھے اور پردیسی نے سب سے پہلے اس محاذ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اس دور میں ان کا مشہور شعر جو اس جنگی تاریخ کا حصہ بن گیا جو لوگوں کے ذہنوں میں کندہ تھا۔

قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پہ لڑیں گے ہم [6]

یہ شعر اس وقت زبان زد عام تھا۔ اس وقت پردیسی کے تین ڈرامے بہت مشہور ہوئے جن کو قومی کلچرل فرنٹ پر ہی اسٹیج کیا گیا جن میں ''قد گو جواری''، ''سوالی'' اور ''مجاہد شیروانی'' خاص اور قابل ذکر ہیں کلچرل فرنٹ میں ان سب کے علاوہ بھی بہت سے ڈرامے پیش کیے گئے جن میں محمود ہاشمی کا ڈرامہ ''کشمیر اُداس یہ ہے''، خواجہ احمد عباس کا ڈرامہ ''چودہ گولیاں'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس شعبے میں دینا ناتھ نادم، موہن لال ایمہ، اوشا کشیپ، خورشید جلاالدین، سمترالکھورا، سنتوش لکھورا، اچلا سچدیو، شیلا بھاٹیہ، شیر جنگ، راج ہنس کھنہ، گردھاری سنگھ، پران کشور وغیرہ قابل ذکر تھے اور یہ ڈرامے سٹیج اور تھیٹر کی تحریک کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات کی عکاسی بھی کرتے تھے۔ اس بارے میں غلام نبی خیال لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں کشمیر پر پاکستانی حملہ دراصل کشمیر کو جبری طور حاصل کرنا تھا لیکن یہ حملہ بھی ناکام ہوا اور کشمیر کے شعراء اور مصنفین میں بیداری

آئی اور کشمیر کو اس وجہ سے اچھے اور خوبصورت شعری ونثری (اردو و کشمیری دونوں زبانوں میں) نمونے مل گئے''۔[7]

پریم ناتھ پردیسی اشتراکی ذہنیت نہیں رکھتے تھے لیکن وہ ترقی پسند ضرور تھے، اسی وجہ سے انہوں نے ہی سب سے پہلے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس طرح سینکڑوں ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ بندوق تھامے راتوں کو سڑکوں پر پہرہ دیتے رہے۔ کلچرل محاذ میں ان کی شمولیت اور سرگرمیاں کسی مصلحت کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ وہ ہمیشہ سے حق کی آواز بننا چاہتے تھے لیکن گھریلو مجبوریوں کی بنیاد پر وہ ہمیشہ ایسا نہیں کر سکتے تھے چونکہ پردیسی سرکاری ملازم تھے اور حکومت ڈوگروں کی تھی۔ اس لیے وہ ڈوگرہ حکومت یا ڈوگرہ ظلم کے خلاف کھل کر نہیں لکھ سکتے تھے اور اگر پردیسی کھل کر لکھتے اور ہمیشہ ایک ہی نام سے لکھتے تو شاید پردیسی اردو ادب کے چند افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد وہ کھل کر لکھ سکتے تھے اور کچھ حد تک لکھا بھی لیکن ان کی ریڈیو کشمیر میں تعیناتی اور غیر معمولی ذمہ داریوں نے انہیں لکھنے کی بہت کم فرصت مہیا کی۔ ڈوگرہ شاہی دور میں اس نے ایک کشمیری ڈرامہ جس کا نام 'بتہ ہر''[8] تھا لکھا۔

لیکن اسٹیج پر چلے ہونے سے عین پہلے مہاراج کے کارندوں نے اس ڈرامے کو ضبط کیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد نہ صرف قلم سے بلکہ انہوں نے ہر قسم کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی یہاں تک کہ بندوق چلانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اب وہ ڈوگرہ شاہی جاگیرداری پر اپنے قلم سے خوب نشتر زنی کرتے تھے۔ وہ نہ صرف قلم کے سپاہی تھے بلکہ وقت کی ضرورت کے مطابق وہ بندوق بردار بھی تھے۔ کیونکہ پردیسی محبِ وطن تھے اور جب ان کا ہی چمن ڈاکوؤں کے چنگل میں تھا تو پردیسی نے مرنے کی قسم کھائی نہ کہ پیٹھ دکھائی، وہ سمجھ چکے تھے

کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کرتا تو آنے والی نسلیں اس کو کبھی معاف نہیں کریں گی، اس سلسلے میں انہوں نے کلچرل محاذ کے نام پر مختلف ادیبوں اور شاعروں کو آگے آنے کی دعوت دی تاکہ اپنے قوم وملک کو بچایا جاسکے۔ اس سلسلے میں کشمیر کے جوان سال شاعر عبدالاحد آزادؔ کے نام وہ کا خط بہت ہی اہم ہے جو اس طرح سے ہے۔

"کلچرل محاذ نمائش گاہ

۲۰ فروری ۱۹۴۸ء

محترمی آزاد صاحب

اس سے قبل بھی میں نے آپ کو خط لکھا تھا، پھر کلچرل محاذ کی طرف سے بھی آپ کو خط لکھا گیا کہ آپ مہربانی کر کے فوراً تشریف لائیں کیونکہ اس وقت ملک کو آپ کی اشد ضرورت ہے اگر اس بار بھی آپ بے رخی سے کام لیں گے تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔ بہ مہربانی فوراً تشریف لائیے اور کلچرل محاذ میں شامل ہوجائیں ہم آپ کی راہ تک رہے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی[9]

(یہ خط موتی لال ساقی نے برج پریمی کو مرحمت کیا اور برج پریمی نے اس خط کو اپنی کتاب میں شامل کیا۔)

پردیسی کی کوششوں سے کلچرل فرنٹ کا حلقہ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوا۔ جس کے بعد کشمیر میں اردو ادب کو بہت فروغ ملا۔ جس میں خاص کر ڈرامہ کی صنف ہے۔ جس نے اس فرنٹ سے زیادہ ترقی کی جس میں محمود ہاشمی کا ڈرامہ "کشمیر اداس ہے" اس ڈرامے کے مکالمے خود پریم ناتھ پردیسی، قیصر قلندر اور صلاح الدین احمد نے لکھے تھے۔ اس زمانے میں دینا ناتھ نادم، موہن لال ایمہ، اوشا کشیپ، خورشید جلال الدین وغیرہ اس ڈرامے کے

ساتھ وابستہ تھے۔ محمود ہاشمی کے ڈرامے کے بعد پردیسی کے ڈرامے اسٹیج ہوئے۔

وادی کشمیر کے اس وقت کے حالات کو اگر پردیسی کی زندگی سے موازنہ کیا جائے ،تو پتہ چلتا ہے کہ کلچرل محاذ نے اس وقت قابلِ قدر کام انجام دیئے ہیں ،تقریباً سبھی ادیبوں نے اپنی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر شعروسخن کی محفلوں میں چار چاند لگائے۔ کسی نے شاعری کے شعبے میں، تو کسی نے ڈرامے کے شعبے میں ،لیکن پریم ناتھ پردیسی واحد شخصیت ہیں جنہوں نے دونوں نہیں بلکہ تینوں میدانوں میں انمٹ نقوش چھوڑ یئے۔ شعر گوئی کے میدان میں دل دہلانے والے شعر کہے، نثر کے شعبے میں دل کو چھو لینے والے ڈرامے اور افسانے لکھے۔ اس کے بعد راتوں کو بندوق لیکر سینہ تان کو پہرہ دیتے رہے۔ اسی وجہ سے ان کی خدمت کا اعتراف سبھی شخصیات نے کیا۔ جس میں اس وقت کے بہت بڑے لیڈر اور ترقی پسند اتحاد کے روحِ رواں غلام محمد صادق اس بات کا اعتراف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"پردیسی نے اس زمانے میں نہ صرف قلم ہی کو سنبھالا بلکہ بندوق بھی سنبھالی اور قومی نوجوانوں کے ساتھ ساتھ باقاعدہ فوجی پریڈ بھی کی"۔ ١٠

سیاسی اعتبار سے جو غیر یقینی حالات اس وقت کشمیر میں تھے۔ ان کے خاتمے کے بعد اس محاذ کو وسعت دی گئی اور اس کو "کلچرل کانگریس" کا نام دیا گیا۔ پہلا شعبہ مصنفین پر مشتمل تھا۔ دوسرا شعبہ ڈرامہ کھیلنے کے لئے وقف رکھا گیا اور تیسرے شعبے میں مصوری پر زور دیا گیا۔ مصنفین کے شعبے کو پراگریسو رائٹرس ایسوسیشن (PWA) کا نام دیا گیا اور اس کی تشکیل میں پردیسی نے اہم کردار ادا کیا اور اس ایسوسیشن کو فعال بنانے میں پردیسی

نے بہت محنت کی، لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد کشمیر میں الگ سے ایک ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ جس میں پردیسی کو بھی دیگر قلمکاروں کے ہمراہ بحثیت نشریاتی مدیر متعین کیا گیا اور پردیسی اس کام میں اس قدر مشغول ہوئے کہ انجمن کے ساتھ ان کے رابطے قدرے کم ہوئے۔ لیکن نظریاتی اور قلمی طور پر انہوں نے آخری وقت تک انجمن کے ساتھ رابطہ بنائے رکھا اور اس انجمن کے اشاعتی مواد میں پردیسی کی کہانیاں بھی شائع ہوتی رہیں۔

پردیسی کا ادبی و شعری سرمایہ:

اکثر ادیبوں کو شروع شروع میں اپنی تخلیقات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑتی ہے، پھر ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے کہ ناشر حضرات خود مصنفین کے پاس مواد حاصل کرنے کے لیے دوڑے آتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ پردیسی کے ساتھ بھی ہوا۔ پہلے پہل پردیسی نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز باقاعدہ ''بہار کشمیر'' میں شعر گوئی سے کیا اور اپنے لئے ''رونق'' تخلص اختیار کیا۔ ''بہار کشمیر'' ہفتہ روزہ تھا اور لاہور سے پنڈت گوپی ناتھ گورٹو کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ''بہار کشمیر'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب ڈوگرہ دور میں ظلم و استبداد کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھی تو گوپی ناتھ گورٹو نے پورا اخبار کشمیریوں کے لئے وقف رکھا۔ اخبار میں کشمیر کی صورتحال پر بھرپور تجزیئے اور تبصرے شائع ہوتے تھے، جن کو لاہور سے اہل علم و دانش پڑھتے تھے اور اپنے تاثرات سے بھی نوازتے تھے۔ اخبار کے قلمی معاونین میں کشف بندھو، دینا ناتھ مست، شیام لال تیرتھ، شنکر ناتھ صفیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان ہی قلمکاروں کی صف میں (۱۹۲۴ء۔ ۱۹۲۵ء) پریم ناتھ پردیسی بھی شامل ہوگئے اور بہت جلد ایک اچھا مقام حاصل کیا اور آج بھی کشمیر کے اردو دبستان میں بڑے اکرام کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ملک کے نامور رسالوں

اور اخبارات کو پردیسی کے افسانوں کا انتظار رہتا تھا لیکن پردیسی اپنے فن کو نکھارنے میں جس اخبار کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہے وہ لالہ ملک راج صراف کا ''رنبیر'' ہے، جو جموں سے شائع ہو رہا تھا۔ اس اخبار کا اجراء ۲۰ر مئی ۱۹۲۴ء میں ہی شروع ہوا۔ جس کو جموں و کشمیر کے پہلے آزادانہ اخبار کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس اخبار کو اپنی ادبی زندگی کا اہم پلٹ فارم سمجھ کر پردیسی اس اخبار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے ''رنبیر'' کو بہت شوق و ذوق سے پڑھا کرتا تھا اور اس شوق نے مجھے اس اخبار میں لکھنے کے لیے آمادہ کیا۔ جب میرا نام پہلی بار اس اخبار میں شائع ہوا تو میں خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے میں ایک بہت بڑا آدمی بن گیا ہوں۔ اور میرے ہاتھوں میں ایسی طاقت آگئی جیسے ساری دنیا میں سیاسی اُنقلاب لاسکتا ہوں۔[11]

چونکہ افسانوں سے پہلے پردیسی نے بچوں کی چھوٹی چھوٹی مگر پُر اثر کہانیاں لکھنی شروع کیں اور بہت وقت تک اطفالِ ادب پر لکھتے رہے لیکن وہ سارا لکھا ہوا کلام ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں ضائع ہوا اور بکھر کر رہ گیا۔ کیونکہ اردو کی چند تاریخی کتابوں سے پردیسی کے ادب اطفال پر لکھی ہوئی کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ بسیار تلاش کے باوجود پردیسی کی ادب اطفال سے متعلق تحریریں دستیاب نہ ہوسکیں، صرف ایک رپورتاژ ''پانچ دن'' تک رسائی حاصل ہوسکی۔

ان کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''پردیسی کی ادبی مساعی کی کامیابیوں نے انہیں مزید اور وسیع تر ادبی

رقیبوں پر حاوی ہونے کی راہیں سمجھائی تھیں۔ قبائلوں کی یورش کا
ایک رپورتاژ ''پانچ دن'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ ایک ڈائری بھی
مرتب کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب کی طرف بھی ان
کی توجہ ہوئی تھی۔ چنانچہ کہانیوں کے چار مجموعے اور ایک ناول
''پوتی'' اور نظموں کے مجموعے مرتب اور شائع کیے تھے جن میں
''چور نگی'' اور ''چار بیٹے'' اور ''کرنیں'' مقبول ہوئے''۔[۱۲]

مارتنڈ جو کہ کشمیر کا ایک بہت ہی معیاری اخبار تھا، جس کی ادارت میں پردیسی نے بہت کام کیا اور سالہا سال تک اس اخبار میں لکھتے رہے۔

پریم ناتھ پردیسی نے اپنی افسانوی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ''سچی پرارتھنا'' سے کیا جو رنبیر کے اپریل ۱۹۳۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ پردیسی کے کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہوا ہے۔ پردیسی نے زندگی کے آخری لمحات تک افسانے لکھے جو بے شمار اخبارات ورسائل کی زینت بنے۔ ان اخبارات ورسائل میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے پردیسی کے فن کو سنوارا اور لوگوں تک پہنچایا۔ اور بہت سے اخبارات ایسے بھی ہیں جن کی پہچان پردیسی کے افسانوں سے ہوتی تھی۔ پردیسی نے ''وتستا'' (جو پنڈت پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں شائع ہوتا تھا) کو شروع سے ہی اپنی قلمی معاونت سے نوازا۔ اس کے بعد بزاز صاحب نے ۱۹۳۵ء میں سرینگر سے ایک ہفتہ وار اخبار ''ہمدرد'' کے نام سے نکالا، جو جولائی ۱۹۴۳ء میں روزنامہ کی صورت میں نکلنے لگا۔ یہاں یہ بتانا ناگزیر سمجھتا ہوں کہ پریم ناتھ بزاز نے کشمیر کی صحافت اور سیاست دونوں میدانوں میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ جو تاریخ میں سنہری حرف سے رقم ہیں۔ پنڈت پریم

ناتھ بزاز نہ صرف ایک صحافی تھے بلکہ وہ کشمیر کی تاریخ آزادی کے بے باک سپاہی بھی تھے اور کشمیر کو ڈوگرہ سامراج سے آزاد کرانے میں ان کا ایک اہم کردار رہا ہے اور وہ آخری وقت تک کشمیر کی مکمل خود مختاری کے لیے اپنے موقف پر کاربند رہے اگر چہ شیخ محمد عبداللہ نے ان کو جیل بھی بھیج دیا۔ پردیسی اور بزاز کے آپسی مراسم بہت قریبی تھے۔ ''ہمدرد'' کے ساتھ ساتھ پردیسی کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں ''مارتنڈ'' کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے جو کہ ۱۹۳۵ء میں ہی معرض وجود میں آیا۔ جس کو کشمیری پنڈتوں کی تنظیم ''یورک سبھا'' کا ترجمان کہا جاتا تھا۔ شری کشف چند اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے اس اخبار نے اپنے ہم عصر اخبارات میں بہت جلد جگہ بنالی اور اچھا نام بھی کمایا۔ اس کے سالناموں، افسانہ نمبروں، اور خاص نمبروں نے شمالی ہندوستان کی اردو دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ جس میں پردیسی کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ اگر چہ پردیسی کی زیادہ تر تخلیقات اسی اخبار سے شائع ہوتی تھی لیکن بدقسمتی سے کشمیر کے نامساعد حالات کی وجہ سے یہ اخبار بند ہوا۔ اس طرح پر آشوب حالات میں کشمیر کا بہت بڑا اور عظیم ادبی سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔ کشمیر میں محکمہ اطلاعات کے شعبہ تحقیق میں مارتنڈ کی کچھ گرد آلودہ جلدیں موجود ہیں لیکن ان فائلوں کا اہم مواد دیمک زدہ ہو چکا ہے۔

پردیسی نے اپنے لئے کئی نام پسند کئے تھے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

شمار	تخلیق کا عنوان	قلمی نام	سنہ اشاعت	رسالہ/اخبار
1	سچی پرارتھنا	پریم ناتھ سادھو رونق	اپریل ۱۹۳۲ء	رنبیر جموں جلد ۷ کہانی

2	مدفون خزانہ	پریم ناتھ سادھو	ایضاً	رنبیر جموں
3	اندھیا	رونق کشمیری	جنوری ۱۹۳۳	وتستا جموں
4	راگنی کے گیت	پریم ناتھ رونق کشمیری	فروری ۱۹۳۴	کرم ویر لاہور
5	بن مالہ	پردیسی	جون ۱۹۳۲	سیلاب لاہور
6	رادھا کا ہار	پریم ناتھ رونق	۱۹۳۷ء	رنبیر جموں
7	پرواز تخیل	ایضاً	ستمبر ۱۹۳۲	افسانہ ایڈیشن روزنامہ سیلاب
8	آواز	سری یت پردیسی	۱۹۳۸ء	روزنامہ مارتنڈ



حوالہ جات:

۱: ہمارا ادب۔ ترتیب؛ محمد یوسف ٹینگ، ۱۹۶۹۔ ص: ۱۰۔۹

۲: پردیسی: چند یادیں کچھ صحبتیں، از قیصر قلندر، ماہنامہ ''آجکل'' جون ۱۹۸۴، ص ۱۹

۳: بہتے چراغ۔ پریم ناتھ پردیسی۔ ص: ۴

۴: کشمیر میں اردو (جلد ۳)۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ص: ۸۶

۵: کشمیر میں اردو (جلد۳)۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ص ؛۲۴

۶: ہمارا ادب :۱۹۶۹۔ص ۔۱۲

۷: Progressive litrary movement of Kashmir

by Ghulam Nabi Khayal:Page no:54

۸: ''بتہ ہر'' ایک کشمیری ڈراما تھا جو کشمیری عوام کی بھوک او افلاس پر لکھا گیا تھا جس میں ڈوگرہ حکومت کی سخت تنقید شامل تھی ،لیکن حکومتِ وقت نے اس کو اسٹیج نہیں ہونے دیا۔

۹: پریم ناتھ پردیسی ؛عہد، شخص اور فنکار ، برج پریمی ،ص :۷۸۔۷۵

۱۰: بہتے چراغ ، پریم ناتھ پردیسی ۔دیباچہ ۔از غلام محمد صادق ،ص ۔۸

۱۱: صحافت کے پچاس سال ، ملک راج صراف ،۱۹۶۱،ص :۱۲۵

۱۲: پردیسی اور اس کا تخلیقی ذہن :عبدالقادر سروری ، ہمارا ادب ،ص ؛۳۱۸

۱۳: روزنامہ ''مارتنڈ'' ۔۱۹ اپریل ۱۹۳۸



پریم ناتھ پردیسی
کے تخلیقی انہار

پریم ناتھ پردیسی بحیثیت افسانہ نگار

شام وسحر

(پہلا افسانوی مجموعہ)

پریم ناتھ پردیسی کی افسانوی زندگی کا آغاز اگرچہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد ان کے افسانوں میں پختگی پیدا ہوئی۔جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔پردیسی کے پہلے افسانوی مجموعہ کا نام ''شام وسحر'' ہے۔جس کو ۱۹۴۱ء میں پردیسی نے خود شائع کیا۔یہ ریاست جموں وکشمیر میں افسانے کے فنی تقاضوں پر اترنے والا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔جس کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔یہ افسانوی مجموعہ دین محمد پریس لاہور میں ملک محمد عارف کے اہتمام سے چھپا اور غلام محمد،نور محمد،جو کشمیر کے اس وقت کے بہت بڑے تاجرانِ کتب تھے ،اپنی انتھک کوشش سے اردو اور کشمیری ادب میں گراں قدر اضافہ کر کے بہت بڑی خدمات انجام دیں۔

''شام وسحر'' کا مقدمہ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا تھا۔اس افسانوی مجموعے کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

''مجھے پنڈت پریم ناتھ پردیسی نے اپنی چند کہانیاں پڑھنے کو دیں

جنہیں پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انہیں چھوٹے افسانے لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ان میں تخیل بھی ہے اور مشاہدے کی قوت بھی۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان افسانوں میں مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کو اپنے ملک کے غریبوں کے ساتھ بہت ہمدردی ہے اور انہوں نے بعض کہانیوں میں ان کی تکلیفوں اور ان کے دردِ دل کی کیفیت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ انہیں اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل ہے ان کی زبان سادہ و دلپذیر ہے''۔[1]

اس افسانوی مجموعے میں کل تیرہ افسانے ہیں، جن میں بیشتر افسانے تو مختلف رسالوں اور جرائد میں پہلے ہی چھپ چکے تھے۔اس مجموعے کے حرفِ آخر میں پردیسؔی نے ''شام وسحر'' کے شائع کرنے کے مقصد کو بھی بیان کر دیا ہے:

> ''مدت سے میرے مہربان اور قدردان دوست اس امر کے لیے اصرار فرمارہے تھے کہ میں اپنے افسانوں کو کتابی صورت میں شائع کروں۔ چنانچہ ''شام وسحر'' کو اگر انہیں کے پیہم تقاضوں کا نتیجہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا''۔[2]

ریاست کے مشہور محقق برج پریمی ''شام وسحر'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پردیسؔی کے پہلے افسانوی مجموعے ''شام وسحر'' کی بیشتر کہانیاں ''مارتنڈ'' میں شائع ہوئیں۔ اکثر کہانیاں اسی پُراسرار دنیا کے ایسے ہی پُر اسرار لوگوں کی کہانیاں ہیں ''راجو کی ڈولی'' ''پارسل'' ''ماں کا پیار'' سنتوش'، ''سلاخوں کے پیچھے'' ''حسین پیمبر'' ''سچا دوست'' ''سندھیا کا شراب'' اسی تخیل کے

افسانے ہیں ان افسانوں کے موضوعات اور پس منظر سے قطع نظر یہ بات پھر بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ ان افسانوں میں انسانی نفسیات کی باریکیوں کو کس حد تک سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے''[۳]

افسانوی مجموعہ ''شام وسحر'' میں شامل افسانے یوں ہیں۔

(۱) راجو کی ڈولی (۲) ماں کا احسان (۳) پارسل (۴) چونی (۵) میرا بوڑھا دوست (۶) اپنا سب کچھ (۷) انسان ساز (۸) بچوں کا ختنہ (۹) اُجرت (۱۰) چور (۱۱) طوفان (۱۲) پنچایت کا فیصلہ (۱۳) فرشتہ رحمت۔

اس افسانوی مجموعے میں مختصر افسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ طویل افسانے بھی شامل ہیں۔ مختصر افسانوں میں ماں کا احسان، میرا بوڑھا دوست، چونی، انسان ساز، طوفان اور پنچایت کا فیصلہ، جبکہ طویل افسانوں میں راجو کی ڈولی، پارسل، اپنا سب کچھ، بچوں کا ختنہ، اجرت، اور فرشتہ رحمت شامل ہیں۔



''شام وسحر''
کے بعض افسانوں کا مطالعہ

راجو کی ڈولی:

راجو کی ڈولی ''شام وسحر'' کا پہلا افسانہ ہے۔ افسانہ ''راجو کی ڈولی'' سات حصوں پر مشتمل طویل افسانہ ہے۔ 'کہانی 'راجو'' کے گرد گھومتی ہے جو بچپن میں یتیم ہوئی اور بعد میں اپنے دادا رمضان جُو کے پاس رہا کرتی تھی۔ رمضان جو پیشے سے حجام تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی سی حکمت بھی جانتا تھا۔ رمضان جو کی حکمت کے سامنے بڑے بڑے ڈاکٹر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ کیونکہ جو بیمار رمضان جو کے پاس آتا تھا، وہ رمضان جو کے ہاتھ لگانے سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ لوگ اس کو دانتوں کی بیماری کا مسیحا سمجھتے تھے۔ ایک دن کسی بیمار کا دانت کیا نکالا کہ اسکی اندر کی نس پھٹ گئی اور منہ سے خون کے چشمے پھوٹ پڑے، مریض بیہوش ہوا اور اس کو اسپتال لے جایا گیا لیکن مریض کے رشتہ داروں نے ایک تو رمضان جو کی خوب پیٹائی کی اور ساتھ ہی پولس تھانے میں رپورٹ بھی درج کروائی۔ اسی دن شام کو پولس نے رمضان جو کو تھانے پہنچایا۔ معاملہ عدالت تک جا پہنچا جہاں پر رمضان

جو کو غیر قانونی حکمت کرنے کی پاداش میں تین مہینے کی سزا ہوئی۔ جس سے گھر کا پورا ماحول بری طرح متاثر ہوا۔ اب گھر میں رمضان جو کی بیوی، بیوہ بہو اور اس کی بیٹی ''راجو'' بالکل تنہا رہ گئیں۔ اب ہونا کیا تھا مہینے بھر کے بعد ہی راجو اپنی ماں کے ساتھ ننیہال چلی گئی اور گھر میں صرف اس کی بیوی رہ گئی۔ کل تک رمضان جو ''راجو'' کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ پاتا تھا لیکن اب وہی راجو گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کورٹ کے فیصلے کے دن گھر سے نکلتے وقت راجو نے اپنے دادا کو ڈولی لانے کے لیے بہت عاجزی کی تھی اور دادا نے لانے کا وعدہ بھی کیا تھا

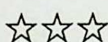
....

''راستے میں جدھر سے ہتھکڑی پہنے ہوئے رمضان کو لیا گیا، کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ رمضان کو یاد آ گیا۔ ''لالہ آج مٹی کی ڈولی لانا'' ایک بار اس نے کانسٹبل سے کہا............ ''مجھے ڈولی لینے دو راجو انتظار کر رہی ہوگی'' کانسٹبل ہنس پڑا بولا............ ''احمق۔ جا رہا ہے جیل کو اور شوق ہے ڈولی کا۔ رمضان کی روح رونے لگی۔ سر نیچے کیے ہوئے وہ چلا گیا'' ؂

رمضان جو کو تھانے سے سیدھے جیل بھیج دیا گیا۔ اسے ڈولی کا ارمان ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ لیکن رمضان جو کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ راجو کی ڈولی خرید سکتا۔ تین مہینے کے بعد اس نے گھر کا ماحول پوری طرح بدلا ہوا پایا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے، رمضان جو کی بیوی بھی انتقال کر گئی۔ اب رمضان جو اپنا زیادہ تر وقت پاس کی مسجد میں ہی گزارتا تھا، لیکن بارہ سال کے بعد جب رمضان جو نے راجو کی شادی کے بارے میں سنا، تو وہ اپنی پوری زندگی کی پونجی جمع لے کر راجو کی ماں کے پاس پہنچ گیا اور اس طرح اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

افسانے میں پردیسی نے خون کے رشتے کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ ساتھ ہی افسانے میں پردیسی نے پورے گاؤں کے ماحول کی عکاسی بھی کی ہیں۔ رمضان جو سماج کا ستایا ہوا ایک شخص دکھایا گیا۔ افسانہ میں کردار نگاری کی بنت کاری بڑی فنکاری سے کی گئی ہے۔ جس سے افسانہ اتنا موثر بن گیا ہے کہ یہ قاری پر اپنی گہری چھاپ ڈالتا ہے۔ افسانے کا اسلوب نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔

مختصراً افسانہ میں مصیبت زدہ انسانوں کی داستانِ غم کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور کہیں کہیں پر شاعرانہ اسلوب بھی برتا گیا ہے۔



ماں کا احسان:

''ماں کا احسان'' پریم ناتھ پردیسی کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ اس مختصر افسانے کو پردیسی نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس دلچسپ افسانے سے ہر انسان کے اندر ماں کی عزت اور حرمت بڑھ جاتی ہے۔ افسانے میں امرتی کے کردار سے ماں کا پیار اور بے شمار احسانات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ ماں اپنے اولاد کے لیے کن کن مراحل سے گزرتی ہے۔

افسانے میں امرتی نام کی عورت کی شادی ایک غریب موچی سے ہوتی ہے، لیکن شادی کے بہت سالوں تک امرتی کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوتا ہے۔ بہت سالوں کے بعد بھگوان نے امرتی کو نتھو کی شکل میں ایک بیٹا عطا کیا۔ اس بچے کے لیے امرتی نے دنیا کے سارے دکھ جھیلے لیکن نتھو کی پرورش میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ چونکہ بچپن میں ہی نتھو کا باپ انتقال کر گیا اور بہو کے شوق کی وجہ سے امرتی نے نتھو کی شادی بچپن میں ہی انجام دی لیکن بھگوان نے نتھو کے گھر میں اتنے بچے دیے کہ ان کے لیے بعد میں کھانا ملنا بھی مشکل ہو گیا۔

اس سب کے باوجود امرتی کو کبھی سکھ کا ایک پل بھی نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ نتھو جب بیمار ہوا تو ماں نے اپنا قیمتی سرمایہ بھیج کر نتھو کا علاج کروایا لیکن اس کے بعد گھر کا کام کاج نتھو کے بڑے بیٹے جیون کے سر پر آ گیا، جو اپنے آپ کو گھر کا ان داتا سمجھتا تھا۔ جیون کا یہ رویہ دیکھ کر کبھی کبھار نتھو رو دیتا۔ جیون بہت شریر اور بد دماغ قسم کا لڑکا تھا جو ہر وقت غصے میں رہتا تھا۔ اور جو کوئی سامنے سے گزرتا وہ سارا نزلہ اسی پر اتارتا۔ دوسری بات نتھو کی بیوی نے بھی اپنے بچوں کو لاڈ پیار سے بگاڑ دیا تھا۔ سب سے زیادہ امرتی کو سزا دینے میں نتھو کی بیوی ہی آگے رہتی تھی۔ ایک دن جب امرتی بیمار ہوئی تو گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ تو امرتی نے لاچار ہو کر اپنے گلے کا تعویز جو چاندی کا تھا اپنے بیٹے کے ہاتھ بیچنے کے لیے بھیج دیا لیکن جب تک وہ واپس لوٹا تب تک امرتی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس طرح اس نے اپنے بے بس بیٹے کے آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔

پردیسی نے افسانے میں غریب گھرانوں کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ خاص کر تب جب وہ نتھو کی بیوی کے کردار کو سامنے رکھتا ہے۔ اس افسانے سے انسان کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ افسانے کا اسلوب بہت سادہ اور دلکش ہیں لیکن پلاٹ میں خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ افسانے میں پردیسی نے ماحول کی تصویر کشی بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ آغاز سے اختتام تک افسانے میں دلچسپی قائم رہتی ہے۔ افسانے میں کشمیر کی افلاس زدہ زندگی کی بہترین مثال پیش کی گئی ہے۔

☆☆☆

چوّنی:

''چونی'' پردیسی کا ایک مختصر لیکن پُر درد افسانہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے ممتا اور افلاس کے بیچ معرکہ آرائی دکھائی ہے۔ ''چونی'' افسانہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں اناّ تین معصوم بچوں کی ماں ہے جو پہلے ہی اپنے خاوند کو کھو چکی تھی۔ اس افسانے میں اناّ معمولی مزدوری کر کے بڑی مشکل سے اپنے تین معصوم بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ ایک دن انا کو بڑی مشکل سے مزدوری میں ایک چوّنی حاصل ہوئی تھی جس کو انا نے بڑے بیٹے کے ہاتھ دے کر بازار سے سودا سلف خریدنے کے لیے دیے دی لیکن اس نے چونی کو قبرستان میں کھو دیا۔ جب چونی کھونے کی خبر انا سنتی ہے تو اس کے اُوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس چونی کو کھونے کے بدلے میں وہ اپنے بیٹے جوّاد کو بہت زیادہ پیٹتی ہے اور بار بار جوّاد کو لیکر قبرستان کی مٹی کو چھان مارتی ہے لیکن وہاں سے اناّ کو کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس مار پیٹ سے جواد بہت بیمار پڑ جاتا ہے جو بعد میں انا کی بے انتہا کوششوں کے باوجود صرف چھ دنوں میں انتقال کرتا ہے اور اس طرح انا اپنے شوہر کی دو نشانیوں کو کھو دیتی ہے جس میں ننھا جواد اور اپنے خاوند کا تحفے میں دیا ہوا چاندی کا تعویذ، جس کو بیچ کر انا نے جواد کے لیے ادویات خریدی تھیں۔

انا اس درد کو عمر بھر چھپاتی رہی۔ اگر چہ بعد میں انا اور اس کے معصوم بچوں نے بڑے ہو کر بہت محنت کی اور ان کی مالی حالت میں بہت حد تک سدھار آیا۔ لیکن تب تک جو اد کے غم نے انا کی آنکھوں کی بصارت چھین لی تھی۔

> ''ایک جمعہ کو سچ مچ اسے قبرستان پر چونی ملی۔ جس پر مٹی کی تہہ جم گئی تھی وہ اسے پا کر دیوانی ہوگئی۔ اس نے چونی پہچانی یہ وہی تھی جو کچھ

عرصہ پہلے جواد سے کھوگئی تھی۔ وہ دوڑ کر جواد کی قبر پر گئی اور اپنا منہ قبر سے لگا کر بولی۔ جواد چونی مل گئی میرے لعل اب نکلو باہر۔ لیکن وہاں کون تھا جو جواب دیتا البتہ اسے محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اندر سے لمبی سانس لے لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا'' ۵

محض ایک مختصر اقتباس کی مثال سے وہ تاثر ذہن کو متاثر نہیں کرتا جو پورے افسانہ کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے جس کو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں، لیکن کبھی محسوس نہیں کرسکتے، جس طرح ہم ''چونّی'' کو پڑھنے کے بعد محسوس کرتے ہیں۔ اس افسانے میں پردیسی نے ماں کے کردار کو بہت متضاد دکھایا ہے کیونکہ ایک طرف اتنا نے اپنے بیٹے کو ''چونّی'' کھودینے پر حد سے زیادہ پیٹا اور دوسری طرف اسی ماں نے جواد کے علاج کے لیے اپنے خاوند کی آخری نشانی اور تحفے کے بطور دیا ہوا چاندی کا تعویذ بھی بھیج دیا۔

افسانے کا پلاٹ بہت سادہ ہے۔ اس افسانے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ تخلیق کار نے افسانہ میں چند ہی کرداروں سے اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے۔ افسانے کی دلچسپی کا عالم یہ ہے کہ یہ قاری کو شروع سے آخر تک ہر لفظ متاثر کرتا رہتا ہے۔ افسانے میں پردیسی کے گہرے شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔



انسان ساز:

''انسان ساز'' پردیسی کا ایک مختصر مگر دلچسپ افسانہ ہے جو چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے صرف دو کرداروں ''حسنیٰ'' اور ''رفیق'' کے ذریعہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی عکاسی ہے۔ افسانے میں ''حسنیٰ'' دنیا کو بدلنے کا ارادہ کرتا ہے

۔اچھی سوچ کے باوجود انسانوں کو بدلنے کے لیے حسنیٰ جو راستہ اختیار کرتا ہے وہ انتہائی وحشیانہ ہے۔ حسنیٰ شہر کے معصوم اور سیدھے سادے انسانوں کو پہلے اغوا کرتا تھا پھر اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچا کر ان کا قتل کرتا تھا۔ اس غار میں حسنیٰ نے مٹی کے کئی پتلے بنا رکھے تھے جن کو وہ روح دینا چاہتا تھا۔ ایک روز وہ اپنا سارا راز ایک دوسرے نوجوان رفیق کو بتاتا ہے جو پہلے اس کے کام میں مدد کرنے کی حامی بھرتا ہے اور موت کے خوف سے کچھ وقت تک مدد بھی کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ جب وہ غار کے راستوں کے بارے میں سب جان جاتا ہے۔ ایک دن حسنیٰ باہر تھے اور رفیق نے غار کو اندر سے بند کر دیا۔ اگرچہ حسنیٰ نے رفیق کو غار کا پتھر ہٹانے پر بہت مجبور کیا لیکن رفیق نے اس کی ایک نہ سنی اور آخر کار رفیق حسنیٰ کو پکڑوانے کے لیے پولس کے پاس چلا جاتا ہے۔

اس افسانے کو پڑھنے کے بعد انسان پہ ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ اعلیٰ ادب کا نمونہ ہے۔ یہ افسانہ قاری پر شروع سے آخر تک ایک خاص پکڑ رکھتا ہے۔ اس افسانے کی زبان بالکل عام فہم ہے۔ ہر درجے کا انسان اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہی وہ افسانے ہیں جن کی وجہ سے پردیسی کو برصغیر کے افسانوی ادب میں اتنا اونچا مقام عطا ہوا۔ اگرچہ ''انسان ساز'' داستانی طرز کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں شروع سے آخر تک تذبذب ہے۔

> ''رفیق نے حیران ہو کر پوچھا اور جب وہ ڈھانچے تیار ہو نگے پھر؟'' حسنیٰ نے کہا ''ہمارے پاس یہ گڑھا خون سے بھرا ہوگا۔ ان میں مساوی حصوں میں خون ڈال دیا جائیگا'' رفیق نے پوچھا ''اور روح وہ کہاں سے آئے گی'' حسنیٰ نے چراغ کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس سے! اس کی لو سے! جو انسان بنانے سے پہلے ہی میں نے

جلا رکھا ہے!''[٦]

جرم وسزا پر مشتمل یہ افسانہ مجرمانہ ذہن رکھنے والے انسان کی وحشت اور بربریت کے ساتھ نفسیاتی الجھاؤ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کا یہ افسانہ اصل میں عبدالحلیم شرر کی ناول ''فردوسِ بریں'' کے طرز پر لکھا گیا ہے ''فردوس بریں'' میں بھی ایک عارضی جنت بنائی گئی تھی جس کے لیے لوگوں سے غلط کام کروائے جاتے تھے۔



اجرت:

(چھ حصوں پر مشتمل)

اُجرت پریم ناتھ پردیسی کا ایک بہت ہی اچھا اور طویل افسانہ ہے جو چھ حصوں پر مبنی ہے۔ افسانے میں صرف تین کردار ہیں۔ خوبصورت رجنی، اس کا بوڑھا اندھا خاوند اور تیسرا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ رجنی کی شادی اس اندھے سے ہوئی ہے جو بچپن میں بہت ہی برے اعمال کر چکا تھا اور اپنی ساری عمر ایک بدکار عورت کے ساتھ گزاری تھی۔ سب کچھ لٹ جانے کے بعد اس عورت نے زہریلے شراب سے اس کی بینائی بھی تباہ کر دی تھی۔ ایک دن رجنی اور اس کا اندھا خاوند گھر میں تھے کہ اچانک کسی نے باہر سے رات کو ٹھہرنے کی التجا کی۔ جب رجنی نے دروازے پر دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی رات کو ٹھہرنے کے لیے پناہ مانگتا ہے۔ خاوند کی اجازت سے رجنی نے اس بوڑھے کو ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اندر آ کر اس نے جو دیکھا تو وہ سراپا حیران رہ گیا اور اس نے رازدارانہ لہجے میں خوبصورت رجنی کو کہا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور وہ اسکے خاوند کی آنکھیں بھی ٹھیک کر سکتا ہے لیکن وہ بھاری قیمت مانگتا تھا۔ رجنی نے دھرم کا پالن کر کے سب کچھ دینے کا وچن دیا۔ حتیٰ کہ اپنی عزت بھی کیونکہ وہ

اپنے سوامی کی آنکھوں کے لیے کچھ بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھی جس پر بوڑھے ڈاکٹر نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا۔لیکن جب ڈاکٹر گھر پہنچتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی اپنی بیٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے جس پر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ وعدے کے مطابق دوسرے دن آتا ہے اور ایک بدلہ ہوا انسان بلکہ ایک باپ اپنی بیٹی کے خاوند کا علاج کرنے والا ڈاکٹر۔ جس پر رجنی اور بوڑھا بہت خوش ہو جاتا ہے اور آخر میں رجنی اس کو اجرت میں وہی پھول واپس کرتی ہے جو اس نے رجنی کو ہوس بھری نگاہوں کے ساتھ دیا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا ''ہاں ایک بار کہہ دو'' میں نے تمھیں معاف کر دیا۔نہیں تو عمر بھر میرا ضمیر مجھے کوستا رہے گا۔زندگی کی راحت نہیں ملے گی۔ کہہ دو ایک بار''۔

رجنی آبدیدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی اور آہستہ سے کہتی ہے۔''میں نے معاف کر دیا۔ جاؤ''اور پھر ڈاکٹر چلا گیا۔!!

افسانے کو پڑھنے کے دوران ایک خاص قسم کی کیفیت قاری پر طاری ہو جاتی ہے ۔افسانے میں جذبات نگاری سے بہت کام لیا گیا ہے، موضوع کے اعتبار سے بھی یہ کہانی پوری اترتی ہے۔ مختصراً یہ کہانی ہم کو اپنے اعمال درست کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

ترقی پسند ذہن سے رچی ہوئی یہ کہانی، محض عورت کی قربانی یا جذباتیت کی کہانی نہیں ہے بلکہ سماج میں ہو رہی ناانصافیوں کی بھی قلعی کھول دیتی ہے۔



پنچایت کا فیصلہ:

(دو حصوں پر مشتمل)

"پنچایت کا فیصلہ" دیہاتی زندگی کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند کی طرز پر لکھا گیا یہ افسانہ بہت ہی مختصر اور متاثر کن ہے۔ اسے افسانہ نگار نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس افسانے میں ٹھاکر دادا کی سال بھر کی کمائی ہوئی کھیتوں کو جے رام اور دوسرے ڈھنگر گھس کر تباہ و برباد کرتے ہیں۔ جب ٹھاکر دادا کو خبر ملتی ہے تو اس کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ جے رام کے بیل کو بہت زور سے مارتا ہے جس پر دونوں کے بیچ بہت ہی زبردست جھگڑا ہوتا ہے اور آخر کار معاملہ پنچایت تک پہنچتا ہے، جہاں پر ایک غیر متوقع فیصلے میں سرپنچ یہ فیصلہ سناتا ہے کہ جے رام بیس من مکئی ٹھاکر دادا کو ادا کرے گا اور ٹھاکر دادا اپنا اچھا بیل جے رام کو اس کے زخمی بیل کے بدلے میں دے گا۔ یہ اس کے بیٹے کے مرنے کے بعد دوسرا موقع تھا جب ٹھاکر دادا اتنا مایوس ہوا۔ ناگوری نام کا یہ بیل اس سے چھینا جا رہا تھا جو اس کے گھر والوں کے لئے بہت ہی قیمتی تھا۔ جب ٹھاکر دادا اور اس کے سبھی پوتے رونے لگے تو ٹھاکر کو اپنا بیٹا یاد آیا جو چند سال پہلے اس کو داغِ مفارقت دے کر انتقال کر گیا تھا اور اپنے پیچھے چند بچے چھوڑ گیا تھا۔ لیکن پنچایت کے فیصلے کے سامنے کسی کی نہیں چلی۔ کچھ دنوں کے بعد ٹھاکر دادا اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا کہ جے رام ناگوری کو اسی راستے سے لے جا رہا تھا۔ ٹھاکر دادا کے پوتوں نے ناگوری کو پہچان لیا اور اس کو پکڑنے لگے جس پر پہلے جے رام کو غصہ آیا لیکن بچوں کی ناگوری کے ساتھ ہمدردی کو دیکھ کر اس کا دل بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے ناگوری کو بچوں کے حوالے کر دیا اور نتیجتاً معصوم بچوں کی معصوم اداؤں نے پنچایت کے فیصلے کو مسترد کر دیا اور سبھی لوگ خوشی خوشی رہنے لگے۔

افسانے کا پلاٹ ڈھیلا ہے جس سے واقعات کی ترتیب میں تسلسل نہیں رہا ہے ۔افسانے میں نمایاں کرداروں نے وہ سب نہیں کیا جو کام معمولی کرداروں سے سرزد ہوا ہے، خاص کر جے رام کے کردار کو بدلنا بہت ہی غیر فطری نظر آتا ہے۔افسانہ نگار کا نقطہ نظریہ ہے کہ دیہات کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اجاگر کیا جائے۔افسانے میں دیہاتی زندگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔اس میں دورائیں نہیں کہ افسانہ پریم چند سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔



فرشتہ رحمت:

(۷ حصوں پر مشتمل)

''فرشتہ رحمت'' پردیسی کا ایک نصیحت آموز افسانہ ہے۔افسانے میں رحیم بیگ گاؤں میں عام اور سادہ لوح لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتا تھا۔اسی وجہ سے رحیم بیگ کی نمبرداری چلتی تھی۔گاؤں کا ہر فرد رحیم بیگ سے بے حد خوف زدہ تھا کیونکہ رحیم بیگ اپنی عیاری اور رشوت سے تمام تحصیل اور پولس عملے کو اپنا غلام بنا لیتا تھا۔ایک دن رحیم بیگ نے تمام کسانوں کو حکم دیا کہ پہلے اس کی کھیتوں میں پانی دینا اور بعد میں اپنی کھیتوں کو سینچنا۔ اس پر ایک کسان غلام محمد نے اعتراض کیا اور رحیم بیگ کے جانے کے بعد اس نے پہلے تمام کسانوں کے کھیتوں میں پانی بھرا اور بعد میں رحیم بیگ کی زمین میں۔ جب رحیم بیگ دوسرے دن کھیت پر پہنچا تو اس کو بہت غصہ آیا۔ جب اس کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی وجہ غلام محمد ہے تو اس نے غلام محمد نامی اس دلیر نوجوان کو بہت پیٹا اور اس کے تمام کھیت کو تباہ و برباد کر دیا۔

لیکن جب لوگوں نے غلام محمد کے اس دلیرانہ قدم کو دیکھا تو ان کی ساری ہمدردیاں غلام محمد کے ساتھ ہوئیں، جس پر غلام محمد نے لوگوں کو نمبردار بدلنے کا مشورہ دیا۔ اگر وہ رحیم بیگ کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، جس پر لوگوں نے لبیک کہا اور غلام محمد کو ہمیشہ کے لیے نمبردار منتخب کر کے اپنے گاؤں کو ظلم سے آزاد کرا دیا۔ اس کے بعد غلام محمد نے گاؤں میں ترقی کے بہت سے اقدامات کئے۔ گاؤں میں اسکول، اسپتال، پُل وغیرہ تعمیر ہو گئے۔ اسی اثنا میں رحیم بیگ نے غلام محمد پر جان لیوا حملہ کیا، جس میں غلام محمد بال بال بچ گیا۔ پھر بھی غلام محمد نے رحیم بیگ کو معاف کیا اور گاؤں میں رہنے دیا۔

افسانے کے پلاٹ کو بہتر ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے اور واقعات کا تسلسل بھی قائم رکھا گیا ہے۔ افسانے میں گاؤں کی ترقی کے لیے لوگوں کو ہوشیار رہنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے علاوہ اس افسانے میں پرانے زمانے میں ہو رہے کسانوں پر نمبرداروں کیمظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ غلام محمد اور رحیم بیگ سماج کے دو مختلف کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں اور لوگ اپنے طاقت یعنی ووٹ کے طاقت سے رحیم بیگ کو غلام محمد میں بدل سکتے ہیں۔ یہ افسانہ قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

لیکن رحیم بیگ کا اچانک تبدیل ہونا کچھ حد تک عجیب سا نظر آتا ہے اس کے باوجود یہ دیہی زندگی کی بہترین مثال قائم کرتا ہے۔

☆☆☆

دنیا ہماری

(دوسرا افسانوی مجموعہ)

پریم ناتھ پردیسی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دنیا ہماری'' ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل پندرہ افسانے ہیں۔ افسانوی مجموعے کو پردیسی نے جموں کے راج محل پبلیشرز سے شائع کیا تھا۔ اس کا صحیح سنہ اشاعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ مجموعہ ۱۹۵۱ میں جموں سے اشاعت پزیر ہوا۔ اس مجموعے میں شائع پندرہ افسانے اس طرح سے ہیں۔

(۱) جنت جہنم (۲) اگلے سال (۳) میرا حق (۴) سہارا (۵) کوا (۶) کاریگر (۷) سکھوں کی واپسی (۸) دنیا ہماری (۹) اصول کی دنیا (۱۰) سائڈ لائن (۱۱) چتائیں (۱۲) لباس تلے (۱۳) لہروں کا رقص (۱۴) تین زاویے (۱۵) فرار۔

''دنیا ہماری'' کا انتساب پردیسی نے اپنے بچپن کے دوست رامانند ساگر کے نام کیا ہے۔ مجموعے کا پیش لفظ مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ وہ اپنے اس پیش لفظ میں پردیسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''اس مجموعے کی کہانیاں سادہ ہیں اور اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ہمیں ٹالسٹائی کی یاد دلاتی ہے۔ اس میں نہ صرف عنصری عواطف

اور نفسِ انسانی کی بنیادی کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ بلکہ تفسیر کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ یہ کہانیاں اسی جذبے کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں گہرے فلسفے کا دوراز کار تخیل اور ان دونوں چیزوں سے وابستہ صوفیانہ نکات کو دیکھنے کی دعوت نہیں دی گئی اور جو کچھ کہا گیا ہے محسوس کر کے کہا گیا ہے اور برملا کہا گیا ہے۔۔۔ پردیسی نے یہ کہانیاں بہت ہی سوچ بچار کے عالم میں لکھی ہیں لیکن ان کہانیوں کی پرسکون سطح کے نیچے ہم ایک ایسا دل دیکھتے ہیں جو انسانیت کے دُکھ سے تار تار ہے۔۔۔ پردیسی کی کہانیوں کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ یہ کہانیاں ہمیں گوناگوں مصائب کو برداشت کرنا سکھاتی ہیں"۔[7]



''دنیا ہماری''
کے بعض افسانوں کا مطالعہ

اگلے سال:

''اگلے سال'' پریم ناتھ پردیسی کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ طویل افسانہ ہے جو ۵ حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں کسانون کی خستہ حالی اور مجبوری کا استحصال کرتے ہوئے بیوپاری طبقے کا اصلی چہرہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانے میں ابراہیم اور حاجی بدرالدین نام کے دو کردار ہیں جن میں ابراہیم ایک غریب کسان ہوتا ہے اور بدرالدین ایک بہت بڑا بیوپاری ہے۔ اس افسانے میں بدرالدین اپنا کاروبار ابراہیم کے کھیتوں سے شروع کرتا ہے اور صرف پندرہ برسوں میں وہ منشی بدرالدین سے حاجی بدرالدین اور پھر سیٹھ بدرالدین بن جاتا ہے۔ جبکہ ابراہیم خان نہ حاجی بن سکا اور نہ سیٹھ۔

جب ابراہیم خان بدرالدین کو دام بڑھانے کے لیے اصرار کرتا ہے تو حاجی بدرالدین نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ دام اگلے سال بڑھیں گے اور اس پر ابراہیم خان نے بھی بدرالدین کے دیئے ہوئے پیسے واپس لوٹا دیئے اور بڑی ہمت کر کے کہا ''اس سال سودا

بھی نہ ہوگا حضرت! خدا نے چاہا اگلے سال سودا کریں گے'' اور اس طرح اس نے حاجی بدرالدین کو حیرت میں ڈال دیا۔

''اگلے سال'' میں افسانہ نگار نے زمین داروں کے بیچ ہو رہی زیادتیوں کو اجاگر کیا ہے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ افسانے کا اسلوب بہت ہی متاثر کن ہے اگرچہ اس میں بڑے کردار صرف دو ہی ہے لیکن کمال فن دیکھیے کہ پردیسی نے دو کرداروں سے سماج میں دو طبقوں کی ترجمانی کی ہے۔ حاجی بدرالدین ساہوں کاروں اور دلالوں کی ترجمانی کرتا ہے اور ابراہیم خان کسان طبقے کو ظاہر کرتا ہے۔ بیوپاری کے ظلم کو پردیسی اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''پندرہ سال پہلے کرتہ پہننے والا بدرالدین آج حاجی بن کر میرے ساتھ سودا کرنے کے لیے اپنے کارندے بھیجتا ہے اور میں جہاں تھا وہیں ہوں نہ محمد ابراہیم بنا۔ نہ ابراہیم خان! نہ بدن سے میلا کرتہ گیا اور نہ کبھی نئی ٹوپی خریدنے کی توفیق ہوئی۔ اس نے میری محنت سے لاکھوں روپیہ بنائے صرف اس لیے کہ اپنی محنت کی قیمت دنیا سے طلب کرنے کا مجھے شعور نہیں اور بیوپاری میری نااہلیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دونوں دنیا حسین بنا رہا ہے'' [8]

افسانے کو پڑھنے سے اس دور کے کسانوں کی بہترین عکاسی ملتی ہے اس افسانے میں پرانے زمانے کے اس طریقے کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جس میں ''پیشگی'' رقم کے سیاق وسباق کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کے طرز پر افسانہ لکھا گیا ہے۔

☆☆☆

میرا حق:

''میرا حق'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے جو ۶ حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک بہت اچھا افسانہ ہے۔ افسانے میں شنکر داس اور عبدل کے کرداروں سے نمک حلالی اور احسان مندی کی بہترین مثالیں پیش کی گئی ہے۔ شنکر داس لاہور سے چھاپ خانہ لاتا ہے اور عبدل کو اس میں ملازم رکھتا ہے۔ عبدل، شنکر داس کی ہمسائیگی میں رہنے والا ایک شریف اور ایماندار انسان تھا۔ اگرچہ شنکر داس کو عبدل سے چند امیدیں وابستہ تھیں لیکن عبدل نے شنکر داس کی امیدوں سے کہیں زیادہ محنت سے پریس میں کام کیا، جس کو دیکھ کر شنکر داس کا دل اندر ہی اندر خوش ہو جاتا ہے۔ عبدل کا دن رات اب پریس میں ہی گذرتا تھا۔ حتیٰ کہ پریس کے ویران آنگن کو بھی عبدل نے اپنی محنت سے خوبصورت باغیچے میں تبدیل کیا۔

''شنکر داس فرطِ عقیدت سے اس کے قریب گئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ''تم اتنا کام کیوں کرتے ہو عبدل کیا تم مجھے احسان سے اس قدر دبا رکھو گے کہ دوسری دنیا میں بھی نہ اتار سکوں'' 9

عبدل پندرہ برس تک پریس میں کام کرتے رہے اب شنکر داس بھی بوڑھا ہو چلا تھا اور اس نے اپنی جگہ اپنے بیٹے گوپی ناتھ کو پریس میں رکھا تھا اور بڑے پنڈت اب زیادہ وقت گھر میں ہی گذارتے تھے۔ عبدل اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جب سے اس نے پریس میں کام کیا۔ اس نے سکھ چین کی روٹی کھائی اور سب سے بڑھ کر ان کے دو بیٹوں کو پریس میں ملازمت بھی فراہم ہوئی۔

لیکن ایک دن عبدل کے ساتھ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ یوں ہوا کہ گوپی ناتھ کے بیٹے نے پریس کے باغیچے سے معصوم پھولوں کے چند پودوں کو اُکھاڑ دیا جن کو

عبدل نے بڑی محنت کے بعد بویا تھا۔اس پر عبدل نے بچے کو ڈانٹ پلائی جب گوپی ناتھ نے بچے کو روتے ہو دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا اور اس نے عبدل کو بہت زور کا تھپڑ امارا اور پریس سے بھی نکالا۔ جس سے عبدل کے دل کو بہت ہی ٹھیس پہنچی۔ اس کے ایک سال کے بعد پریس میں نقص پیدا ہوا جس کو ٹھیک کرنے کے لیے چھوٹے پنڈت نے شہر کے تمام کاریگروں کو بلایا۔ عبدل کو اس بات کی خبر ہوئی تو بڑی ہمت کر کے اس نے گھر سے نکل کر پریس کو ٹھیک کر کے نمک حلالی کا ثبوت فراہم کیا اور پریس کو ٹھیک کرنا اپنا حق سمجھا۔عبدل نے جب پریس کا نقص نکالا تب گوپی ناتھ کو عبدل کی کاریگری کا اندازہ ہوا اور کہا..........

''گوپی ناتھ ششدر رہ گیا اس نے کہا ''عبدل تم کتنے بڑے کاریگر ہو''

عبدل نے کہا'' کاریگر نہیں ہوں بندر ہوں بے حیا بندر''

گوپی ناتھ کو باغیچے کا واقعہ یاد آیا اور اس نے زمین کی طرف دیکھ کہا عبدل تم مجھے معاف نہ کرو گے؟''

عبدل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

معاف نہ کیا ہوتا تو آج یہاں کیسے آتا۔ یہ سچ ہے کہ تم نے میرا حق چھینا۔لیکن میں اپنا فرض نہ بھول سکا''۔[10]

''میرا حق'' پردیسی کے فن کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔افسانے میں سماج کے بہت سے مسائل کی نشاندہی ہوتی ہے۔جس میں بے روزگاری بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ شنکر داس اور عبدل کے کرداروں سے اس دور کے ہندو مسلم اتحاد کو بھی ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔اس افسانے میں ہماری ساری ہمدردیاں عبدل کے ساتھ ہے جس نے گوپی ناتھ کے بُرے برتاؤ کے باوجود بھی اپنے فرض کو پورا کیا۔ یہ افسانہ شروع سے آخر

تک قاری پر اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے۔



سہارا:

''سہارا'' نسوانی ذہنیت کے الجھاؤ پر لکھا ہوا ایک بہترین افسانہ ہے۔ افسانے میں متوسط طبقے کی لڑکی کی ذہنی امنگوں، آرزوؤں اور الجھاؤ کی عکاسی کی گئی ہے۔ نصیرن ایک عام ہندوستانی لڑکی ہے جو شادی کی عمر کو پار کرنے کی وجہ سے ایک عجیب الجھن کا شکار ہو جاتی ہے اور اس دباؤ کے تحت اس کا ذہن روز بروز تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ وہ ایک انگریز میم صاحبہ کے بچے کی پروش پر مامور ہوتی ہے۔ ہر روز وہ اس بچے کو باغ میں سیر و تفریح کے لیے لے جاتی ہے، وہاں باغ میں بہت سی کشمیری عورتیں سوکھے پتے جمع کرنے کے لیے روز آیا کرتی تھیں تاکہ سرما کے موسم میں کانگڑیوں میں استعمال کیا جائے۔ باغ میں نصیرن پر ایک خاص کیفیت تب طاری ہو جاتی ہے جب وہ اپنی سے چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے بارے میں سنتی ہے کہ ان کے چار چار بچے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر نصیرن پر ایک نفسیاتی دباؤ پڑ جاتا ہے۔ ایک دن اسی کیفیت میں وہ جب بنگلے پر پہنچی تو اس نے باورچی خانے میں موجود نوبت خان سے شوربہ مانگا اور نوبت خان نے نصیرن کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر لیا۔ جس پر نصیرن کو بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کو اپنی عیش پرست زندگی سے وہ کشمیری عورتیں اچھی لگنے لگتی ہیں۔ اسی اثناء میں وہاں سے ایک بھنگی کا گزر ہوتا ہے جو طویل عرصے سے نصیرن سے اپنی بیٹی کے لیے دوپٹہ مانگتا تھا کیونکہ وہ بھنگی بھی اپنی جوان بیٹی کے عزت کے لیے کوشاں تھا۔ اس ساری صورتِ حال سے نصیرن کو اپنے عزت نفس کی بہت فکر لگی رہتی ہے جس سے اس کے ذہنی دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔

افسانے میں نصیرن کی نفسیاتی کیفیت کے ساتھ ساتھ کشمیری عورتوں کی کسمپرسی کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔افسانے میں ایک مرد کے سوا سارے کردار عورتوں کے ہیں۔اس میں عورتوں کے چار روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ایک روپ میں عورت میم صاحبہ ہوتی ہے، دوسرے میں نصیرن، تیسرے میں کشمیری عورتیں اور چوتھے میں بھنگی کی بیٹی کا روپ ہے۔ ہر عورت کا رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اس کے علاوہ اس افسانے میں مرد کے وحشیانہ پن کی بھی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔افسانے میں late Marraige کے اثرات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور انگریزوں کی شاہانہ زندگی کے علاوہ کشمیری عوام کی بدحالی بھی سامنے آتی ہے۔یہ کہانی پردیسی کی ادبی کاوشوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔



کاریگر:

''کاریگر'' پریم ناتھ پردیسی کا ایک مختصر اور شاہکار افسانہ ہے۔افسانے کے ذریعے مصنف نے سماج کے تین اہم طبقات کی نشاندہی کی ہے۔ان طبقات کے طریقے کار اور روزمرہ کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔افسانے میں ایک ہندستانی سیاح، جو کہ نفسیاتی معلم ہوتا ہے، اپنی معشوقہ کو خوش کرنے کے لیے پیپر ماشی کا ایک سنگار بکس بنانے کے لیے دوکاندار کو آرڈر دیتا ہے۔دوکاندار سیاح کا ذوق دیکھ کر اس کو اپنے کارخانے کے بہترین کاریگر مام دین سے ملواتا ہے۔سیاح مام دین کے کام سے بہت ہی متاثر ہوتا ہے لیکن جب وہ مام دین کی اُجرت سنتا ہے تو اس کو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی محنت کا ثمرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔جبکہ مام دین اس کام کے لیے بہت زیادہ پیسوں کا حقدار ہے۔بہر حال سیاح نے اپنے ذوق کے مطابق مام دین کے سامنے اپنے سنگار بکس کی فرمائش کی اور کہا کہ

اچھا سنگار بکس بنانے پر وہ مام دین کو معاوضے کے علاوہ انعام بھی دیگا۔

مام دین نے مقررہ وقت پر اس سیاح (نفسیات کے معلم) کے لیے اس کے کہنے کے مطابق ایک نرالا نقشے والا سنگار بکس تیار کیا۔

جب سیاح دس دن کے بعد اپنا سنگار بکس لینے آتا ہے تو وہ مام دین کے ہنر کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے کیونکہ مام دین نے سنگار بکس پر ایک اژدہے کی شکل بنائی تھی، جو منہ کھولے کسی چیز کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ پہلی نظر میں سیاح بہت ہی متاثر اور خوش ہو جاتا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس کو سنگار بکس کے اژدہے میں مام دین کی روح نظر آتی ہے اور جیسے وہ اژدہا پوری دنیا کو تباہ و برباد کرنے جا رہا ہے۔ اس خیال کے بعد نفسیات کا معلم مام دین سے معافی مانگتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ وہاں سے بہت تیزی سیس نکل جاتا ہے اور مالکِ دوکان یہ سب دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

اس افسانے کے بارے میں حامدی کاشمیری ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کاریگر میں ایک بدیسی سیاح، جو نفسیات کا معلم ہے، لکڑی پر کام کرنے والے کاریگر مام دین سے ملتا ہے۔ وہ ایک معمر کاریگر ہوتا ہے، میلی سی شلوار میں ملبوس جس کے تانبے کی طرح سیاح مائل و سرخ جسم کی ہڈیاں تک گنی جاسکتی ہیں وہ حسن کار لیکن نحیف و نزار ہے اور افلاس کے بوجھ سے دبا ہوا ہے......

سنگار بکس پر اژدہے کی تصویر کھدائی ہوئی ہے جو منہ کھولے کسی چیز کے پیچھے بھاگے جا رہا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ محسوس کرتا ہے''[11]

یہاں پر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سیاح بدیسی نہیں بلکہ ہندوستانی ہوتا ہے جیسا کہ حامدی صاحب لکھتے ہیں اس افسانے میں مزدوروں کی افلاس زدہ زندگی کو بڑے

فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح غریب کاریگراور مزدوراپنا خون پسینہ ایک کرکے محنت مزدوری کے بعد سرمایہ دار طبقے کے ظلم کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کاریگر میں مام دین محنت کش طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور دوکاندار استحصال طبقے کی۔ اس افسانے کا اسلوب نہایت آسان اور سادہ ہے۔ چند ہی کرداروں کے باوجود اس افسانے میں سماج کے بہت اہم مسائل کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے کو پڑھتے وقت انسان اپنے آپ کو اس افسانے کے کردار میں کہیں نہ کہیں ضرور پاتا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ افسانہ قاری پر ایک مضبوط پکڑ قائم رکھتا ہے اور قاری پڑھنے کے دوران خود بھی سہم جاتا ہے۔ سیاح کے ذوق اور پسند کو مصنف کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''پھر اس نے مام دین سے کہا۔'' استاد ہمیں ایک سنگار بکس کی ضرورت ہے جس پر کوئی خوبصورت سی چیز ہو۔ میرا مطلب ہے ہمارے مذاق کے مطابق بیل بوٹے نہیں ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں نہیں بس کوئی جادو کوئی پرندہ اُڑتا ہوا بھاگتا ہوا، آزاد اور مسرور خوبصورت اور جاذبِ نظر! سمجھ گئے؟''[۱۲]



سائڈ لائن:

''سائڈ لائن'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے جو ایک افسانہ نگار نا گندر کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے اپنی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ ''سائڈ لائن'' انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا معنیٰ دوسرا راستہ یا دوسرے ذرائع کہہ سکتے ہیں۔ افسانے میں مصنف کشمیر کی بے روزگاری کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اپنے آپ کو اس افسانے میں

بحثیت ایک کردار پیش کرتا ہے۔ پہلے وہ ایک سرکاری ملازم ہوتا ہے اور اضافی وقت میں وہ افسانے بھی لکھتا ہے، اگرچہ افسانوں سے مصنف کو بہت شہرت ملتی ہے لیکن گھر کا گزارا وہ اسی نوکری سے چلاتا ہے جس نوکری سے وہ نفرت کرتا ہے اور آئے روز اس نوکری کو چھوڑنے کی بات کرتا ہے۔ جس اخبار میں اس کے افسانے چھپ جاتے ہیں اس کا نام ''نئی صبح'' ہے۔ جس کا ایڈیٹر بہت ہی چرب زبان ہوتا ہے اور وہ مصنف سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ نوکری کو خیر آباد کہتا ہے تو وہ اس کو اخبار میں نوکری دے گا۔ دھوکے میں آ کر افسانہ نگار نوکری چھوڑ دیتا ہے، اور سوچتا ہے کہ اس کی سائڈ لائن یعنی افسانہ نگاری بہت مضبوط پیشہ ہے۔ لیکن نوکری چھوڑنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کو پتہ چلتا ہے کہ افسانے لکھنے سے اس کو عزت اور شہرت ضرور ملے گی لیکن پیسہ نہیں جس سے وہ اپنی دنیا بسا سکے۔ اور چونکہ عزت نہ کھانے کی چیز ہے اور پہننے کی۔

افسانے میں کئی تصویریں ابھرتی ہیں جن میں اخبارات کے مالکان کا رویہ قابل ذکر ہے۔ جو مصنفین کی محنت کا معاوضہ ادا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ کشمیر میں ملازمتوں میں کم تنخواہ کا بھی اشارہ ملتا ہے جو کہ ڈوگرہ سرکار کا شیوہ تھا۔ افسانے کا اسلوب منجھا ہوا ہے۔ آخر پر افسانہ نگار کو جو نا امیدی اس اخبار کے دفتر سے ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ قابل دید ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ قاری پر ایک عجیب اثر پیدا کرتی ہے۔ اور کس طرح اخبار کے مالک نے ناگندر جیسے شریف افسانہ نگار کو بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ دیا:

> ''ایڈیٹر نے مسکرا کر کہا اور پھر ساری ہمدردی کو لفظوں میں جمع کر کے کہا۔ ''افسوس ہے ہمارے پاس اس وقت گنجائش نہیں......''[۱۳]

اس ایک جملے نے کس طرح ناگندر کی پوری دنیا ہی اجاڑ دی۔ اس کا اندازہ ایک بے روزگار کے سوا کون کر سکتا ہے۔ یہ کہانی دراصل پریم ناتھ پردیسی کی نجی زندگی کی عکاسی

کرتی ہے۔ ناگندر کوئی اور نہیں بلکہ خود پریم ناتھ پردیسی معلوم ہوتا ہے۔



چتائیں:

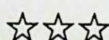
''چتائیں'' ایک مختصر افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے ہندو سماج کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ جس میں ہندو سماج میں موجود مختلف بُرے اور غیر مذہبی عقیدے عام اور غریب لوگوں کے لیے جینا مشکل کرتے ہیں۔ افسانے میں ایک بزرگ ریٹائرڈ اسکول چپراسی سورج رام کی بیٹی کی درد بھری کہانی پیش ہوئی ہے۔ سورج رام کی بہت سی اولادیں پیدا ہوتیں ہیں لیکن صرف جانکی ہی بچ سکی اور باقی سبھی پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ جانکی کی پرورش ناز و نعم سے ہوتی ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سورج رام اس کی شادی ایک کھاتے پیتے پنڈت گھرانے کے اکلوتے ملازم بیٹے سے کرتا ہے۔ تاکہ وہ آرام و آسائش کی زندگی گزار سکے لیکن شومئی قسمت جانکی صرف دو سالوں میں ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار دو سالوں کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جب اس کو جانکی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو سال کے بعد ہی بیوہ ہوگئی ہے تو اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ شیوراتری کے تہوار پر لوگ اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہمیں اپنی نظموں اور گیتوں سے محظوظ کرے گا۔ لیکن وہ عمداً اس سال تہوار کے دن ''روداِدِ جانکی'' سناتا ہے جس کی وجہ لوگ اس کو بڑی بے رحمی سے اسٹیج سے گھسیٹتے ہیں اور بے عزت کر کے نیچے لاتے ہیں، شاید اس لئے کہ اس نے سچ جو بولا تھا۔

افسانے میں ایک کم عمر ہندو ودھوا (بیوہ) کی داستانِ غم کے ذریعے ہندو سماج کے بُرے رسوم کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ افسانہ نگار عورتوں کی دوسری شادی کے

بارے لب کشائی کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں کہ ایک بیوہ عورت پر سماج اور مذہب کے نام پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور کس طرح لوگ سماجی رسوم کو مذہب سمجھ کر جاہل بن جاتے ہیں۔ ان بُرے رسوم کے بارے میں پردیسی لکھتے ہیں:

''ایک معصوم لڑکی کا سب کچھ ہمارے سامنے لُٹ جاتا ہے اور ہم آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے چاروں طرف بھولی بھالی زندہ لڑکیوں کی ہزاروں ''چتائیں'' جلتی ہیں اور ہم ان شعلوں کی تپش تک محسوس نہیں کرتے کس قدر مردہ دلی، کتنی خوفناک غفلت!''[۱۴]



لباس تلے:

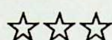
''لباس تلے'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے جو طنز کے پیرایے میں لکھا گیا ہے۔ ''لباس تلے'' پریم ناتھ پردیسی کی ایک شاہ کار تخلیق ہے۔ مزاحیہ طرز پر لکھا گیا یہ افسانہ ایک غریب نوکر کے احساسات اور جذبات سے روشناس کراتا ہے کہ امیر اور غریب کی زندگی میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس افسانے میں وشومبر ایک معمولی نوکر ہوتا ہے جس کو اپنا مالک بڑے دن کی خوشی کے موقعہ پر اپنا پرانا اوورکوٹ دان میں دیتا ہے۔ اس کوٹ نے مانو وشومبر کی دنیا ہی بدل دی۔ اس کوٹ سے اس کو اپنا مالک بہت ہی سخی نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ ہر طرف اس کو اپنا پن محسوس ہوتا ہے۔ دو دن بعد جب وہ کوٹ پہننے کے بہانے بازار چلا جاتا ہے جہاں دل میں چھپے بہت سے ارمان نکالنے کا یقین تھا اگرچہ وشومبر کے پاس صرف بارہ آنے تھے جس میں اس کو ضرورت کی چند چیزیں بھی خریدنا تھیں لیکن اس سب

کے باوجود نیم عریاں تصاویر کی دوکان پر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو بے عزت کر کے واپس لوٹ آیا۔ اسکے بعد وشومبر کو ایک بہت پرانا قصہ یاد آیا کہ جب اس نے بہت پہلے ایک طوائف سے مار کھائی تھی کیونکہ وشومبر نے اس کی طرف صرف دیکھا تھا وہ بھی پرانے کپڑوں میں لیکن آج وشومبر کوٹ پہننے سے انسان لگ رہا تھا۔ اس پرانی یاد کے سہارے اوورکوٹ پہن کر وشومبر سارے کام چھوڑ کر طوائف کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن وہاں پر وہ ایک ڈرنک کی بھی قیمت ادا نہیں کر سکا۔ جس پر وشومبر کو بہت حزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس کو وہاں سے بری طرح نکالا گیا جس پر وشومبر کو یقین ہو گیا کہ مالک کے کپڑے پہننے سے کوئی مالک نہیں بن جاتا ہے اور جب اس روز وشومبر گھر پہنچ جاتا ہے، آنگن میں پہنچ کر کتّے نے بھی بھونکنے سے وشومبر کو مالک کا کوٹ اتارنے کی الٹی میٹم دے دی۔ اور تب جا کر وشومبر کو یقین ہوتا ہے کہ اچھے کپڑے پہننے سے غریب کبھی بھی مکمل انسان نہیں بنتا کیونکہ آنگن کے کتے کو بھی وشومبر کا کوٹ پرایا لگا جبکہ کتا وشومبر کو بھی اور اورکوٹ کو بھی برسوں سے جانتا تھا۔

افسانے میں مزدوروں اور غریبوں کی زندگی کا بہترین نقشہ کھینچا گیا۔ افسانے کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ قاری ان کرداروں کو برسوں سے جانتا ہے۔ افسانے کا اسلوب سادہ سہل اور عام فہم ہے۔ افسانہ قاری پر ایک پر گہری چھاپ چھوڑتا ہے، افسانے میں اگرچہ تضحیک بھی ہے لیکن ساتھ ہی سماج کے لیے ایک نصیحت بھی ہے۔ اسی تناظر میں پردیسی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ (وشومبر) آگے چلتا گیا۔ بالکل؟ غیر ارادی طور پر کبھی کبھی جب بے اختیار اس کے ہاتھ جیبوں میں چلے جاتے اور انگلیاں پیٹ سے چھو جاتیں تو اسے احساس ہوتا کہ اوورکوٹ کی جیبیں پھٹی

ہوئی ہیں۔ وہ گھبرا کر آگے پیچھے دیکھتا کہ کسی نے انگلیوں سے پیٹ کو چھوتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ لیکن دنیا باطن کو نہیں دیکھتی وہ صرف ظاہر پرست ہے اور وشومبر ظاہری طور پر آج بالکل شریف اور مکمل انسان دکھائی دے رہا تھا''۔[15]



''بہتے چراغ''

(دوسرا افسانوی مجموعہ)

بہتے چراغ پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں کا آخری مجموعہ ہے۔ اگرچہ یہ مجموعہ پردیسی کے وفات کے بعد ۱۹۵۵ء میں ہی شائع ہوا۔ اس مجموعے کو اس وقت کے قابل قدر سیاست دان غلام محمد صادق نے ترتیب دیا اور بعد میں شائع بھی کروایا۔ اس مجموعے میں کل ۲۰ افسانے ہیں چونکہ یہ افسانوی مجموعہ پردیسی کی وفات کے بعد شائع ہوگیا ہے تو اس میں برج پریمی کے بقول پردیسی کے تین غیر مطبوعہ افسانوی مجموعوں کا انتخاب شامل ہیں۔

> ''یہ دراصل ان کے تین غیر مطبوعات کا منتخب مجموعہ ہے ''بہتے چراغ'' میں سچے کشمیر کے سچے ترجمان کی روح نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں ان بدنصیب لوگوں کے دل دھڑکتے ہیں جو جنتِ کشمیر کے دوزخ میں صدیوں سے رہتے آئے ہیں...... موضوع کے لحاظ سے یہ افسانے متنوع موضوعات پر مبنی ہے، ان میں امنِ عالم کی شدید خواہش بھی نظر آتی ہے اور استحصالی قوموں کیساتھ لڑنے کا جوش بھی۔ کشمیری کاریگروں اور فن کاروں کی بھوکی زندگی کا احساس بھی

ہوتا ہے"۔[16]

ریاست کے اردو افسانوں کے حوالے سے "بہتے چراغ" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان افسانوں کے ذریعہ پردیسی نے لوگوں کو شخصی نظام، مذہبی تعصبات، توہمات، اقتصادی نابرابری اور افلاس کے خلاف اکسایا ہے۔

"بہتے چراغ" کے تعارف میں کشمیر میں ترقی پسند تحریک کے صدر اور سابق وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق لکھتے ہیں۔

"اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں انکی ۱۹۴۸ء تک لکھی ہوئی کہانیوں میں سے منتخب کی گئی ہیں اور اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں...... پردیسی کی کہانیوں کے دو الگ مجموعے "شام وسحر" اور "دنیا ہماری" قبائلی حملے کے متعلق ایک رپورتاژ "پانچ دن"۔ اس مجموعے کی تقریباً تمام کہانیاں ان کے غیر مطبوعہ مجموعوں "ڈھول" کیچڑ کے دیوتا اور "جنگ اور نغمہ" سے لی گئی ہیں"۔[17]

پردیسی کی زندگی کے گوناگوں مسائل و مصائب اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ احساس یکجہتی کا ایک احساس بہتے چراغ کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے بیشتر افسانے برصغیر کے مختلف نامور رسالوں اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس افسانوی مجموے کو پردیسی کی وفات کے صرف آٹھ مہینے بعد منظر عام پر لایا گیا۔ اس افسانوی مجموعے میں سید احتشام حسین، پریم ناتھ دؔر اور سہیل عظیم آبادی کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

سید احتشام حسین پردیسی کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خلوص اور بے تکلف انداز پردیسی کے افسانوں کی جان ہے، نہ ان

میں کھینچ تان ہے اور نہ تصنع ، نہ واقعات توڑ مروڑ کر بیان کیے گئے ہیں اور نہ نتیجہ محض نتیجہ نکالنے کے لیے نکالے گئے ہیں۔ پردیسی کو کشمیری تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔[۱۸]

بہتے چراغ میں افسانوں کی ترتیب وار فہرست کچھ اس طرح سے ہے۔

(۱) دھول (۲) کاریگر (۳) لباس تلے (۴) اُجالے اندھیرے (۵) کتبے (۶) انکوٹ (۷) سوغات (۸) سیلز مین (۹) اگلے سال (۱۰) ٹیکہ بٹنی (۱۱) جہاں سرحد ملتی ہے! (۱۲) پھسلن (۱۳) خون اور سکے (۱۴) دیوتا کہاں ہیں (۱۵) نئی صبح (۱۶) امام صاحب (۱۷) سنکرات (۱۸) جھنجنا (۱۹) نئی سڑک (۲۰) بہتے چراغ۔



"بہتے چراغ"

کے بعض افسانوں کا مطالعہ

ڈھول:

ڈھول پردیسی کا بے حد دلچسپ اور معنی خیز افسانہ ہے۔افسانے میں ایک لاچار عورت کی داستانِ غم کو پیش کیا گیا ہے جس سے کشمیری عورت کی مفلسی اور لاچاری کا بھی خوب اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس لاچار عورت کی شادی آٹھ سال پہلے ہوئی تھی لیکن شومئی قسمت اس کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔اس کو پتہ چلا ہے کہ بچھواڑے کے علاقہ میں ایک نرس رہتی ہے جو کوئی خاص دوائی بناتی ہے جس سے مایوس مریض بھی خوش ہوتے ہیں لیکن اس دوا کو خریدنے کے لیے پانچ روپیوں کی ضرورت ہے۔جس کو اس نے جمع کرنے کی بہت کوششیں کیں لیکن ہر بار ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب بھی اس نے دو آنے کر کے تین یا چار روپیہ جمع کیے تو اس کا بدذات خاوند یہ جمع پونجی شراب پر خرچ کرتا تھا اور اس کا خواب چکنا چور ہوجاتا۔ایک بار بڑی مشکل سے اس۔ نے خاوند سے بچا کے پانچ روپیہ بھی جمع کیے تھے لیکن عین وقت اس کا خاوند بیمار پڑا اور اس کو تھیلے کا منھ کھول کر اس کا علاج کرانا پڑا بلکہ کچھ پیسے ادھار بھی لانے پڑے۔اس کے باوجود بھی خاوند اس معصوم عورت کو طعنہ دیتا

تھا۔ دن گزرتے گئے، ایک صبح وہ ڈل کے کنارے پانی لانے کے غرض سے گئی جہاں پر اس نے ایک ہندوستانی سیاح کو کشمیری آدمی کے ہمراہ لوگوں کو فوٹو کھینچتے ہوئے دیکھا۔ بہرحال یہ ایک معمول تھا کہ باہر کے سیاح اکثر کشمیری عورتوں اور بچوں کے میلے بدن کی تصویریں اتارتے رہتے تھے لیکن اس بار کچھ عجیب سا ہوا۔ ایک سیاح نے اپنے کشمیری نوکر سے اس کو کہلوایا کہ وہ اس کی تصویر اتارنا چاہتا ہے پہلے تو اس نے منع کیا لیکن بعد میں پانچ روپیہ کے لالچ نے اس کو دوا کی پڑیا یاد دلائی اور وہ فوٹو کھینچنے پر آمادہ ہوگئی۔ اس وقت اس کو اپنے خواب پورے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسی روز اس نے اپنے مستقبل کے لیے پانچ روپیہ کی پڑیا لائی اور ساتھ میں اپنے خاوند کے طعنوں کا جواب بھی دیا جو اس کو ہر وقت بانجھ عورت کہہ کر ذلیل کرتا تھا۔ کچھ مہینوں کے بعد جب اس کا خاوند ٹھیک ہونے لگا اور کام پر جانے کے لائق ہوگیا۔ تو اچانک ایک دن اس نے وہی تصویر ساتھ لائی جو اس سیاح نے پانچ روپیہ کے بدلے میں کھینچی تھی بس اس تصویر کی وجہ سے اس کے خاوند نے کیا کچھ نہیں کہا جس کو سن کر وہ عورت فرش پر گر گئی اور جیسے وہ بچہ اس کی پیٹ سے غائب ہوگیا اور اس کی جگہ صرف دسول نظر آرہی تھی۔ اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی اس عورت کے نصیب میں خوشی کے چند لمحات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا حتیٰ کہ بڑی سے بڑی قربانی بھی اس عورت نے اپنے خاوند کے لیے پیش کی تھی۔

اس افسانہ سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہیں کہ نازک اور نحیف عورت پر کتنا ظلم ہورہا ہے۔ خاص کر ان عورتوں کا درد اس افسانے میں عیاں ہے جن کے ہاں بچہ نہیں ہوتا۔

افسانے میں کشمیری عورتوں کی کسمپرسی اور کشمیر کی غریبی کو خاص طور پر اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سماج کے کچھ ایسے مسائل کی طرف ہمارا دھیان متوجہ کیا گیا ہے۔ جو اکثر

لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن پردیسی اکثر ان ہی مسائل کو افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔

''اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اُبھرے ہوئے پیٹ پر پھیرا۔ اسے شدت سے محسوس ہوا جیسے اس کے پیٹ میں وہ بچہ نہیں جو اس کی زندگی کی لَو کو جلائے رکھے گا بلکہ ڈھول ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے مستقبل پر چھائی رہے گی''۔[19]



کتبے:

''کتبے'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے۔ ''کتبے'' پردیسی کی کہانیوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس افسانے میں ایک سپاہی کے دو روپ سامنے آتے ہیں۔ سلام آباد اوڑی کا رہنے والا سپاہی رحم علی جب تبادلے کے بعد سرینگر میں ایک سرکاری عمارت کی پہرہ داری پر تعینات ہوتا ہے تو اس کو سلام آباد کے تھانے کے وہ دن یاد آتے ہیں جہاں پر اس نے بے پناہ دولت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اس دولت سے رحم علی نے سلام آباد میں ایک محل نما مکان تعمیر کیا تھا اور دو شادیاں بھی کیں تھیں تاکہ گھر میں بہت بچے ہوں اور بڑے مکان میں وہ چہل پہل قائم رہے۔ لیکن شہر میں ڈیوٹی کے دوران نہ وہ پیسے ملتے تھے اور نہ وہ عزت۔ ''دو دنوں کی ڈیوٹی میں رحم علی کو کوئی سستی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن تیسرے دن اس کو ڈیوٹی سے بہت نفرت ہوئی کیونکہ وہ اس طرح کی ڈیوٹی کا عادی نہیں تھا اس کو کبھی اپنے بچوں کی یاد آتی رہی اور کبھی اپنی بیویوں کی۔ لیکن کافی دیر کے بعد اس کی نظر ایک چنار پر پڑی جس کی طرف دو دنوں تک شاید اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن جب چنار پر اس نے

غور سے دیکھا تو اس پر بہت سے نام کنندہ تھے۔ کچھ پنڈت نام تھے، کچھ سکھ نام تھے اور ساتھ ہی بہت سے نام مسلمانوں کے بھی کنندہ تھے۔ پہلے تو رحم علی کو اسلامی تعلیمات یاد آ گئی لیکن فوراً اس کو بچپن میں پڑھا ہوا سبق، جس میں اشوک کے کتبوں کے بارے میں پڑھا تھا، یاد آیا۔

جس نے اشوک کو آج تک زندہ رکھا تھا۔ اور آخر کار اس نے سنگین کی نوک سے اپنا نام بھی چنار کے تنے پر کنندہ کیا۔ اپنے شعور کے مطابق اس نے اپنے آپ کو سلام آباد اوڑی کا اشوک بنا دیا اور ڈیوٹی کے اختتام پر رحم علی نے اس پر فخر بھی کیا کہ اب جو بھی یہاں سے چلے گا۔ رحم علی کا نام ضرور پڑھے گا۔ رحم علی نے چنار کو اپنے بندوق کے سنگین سے کریدنے کے منظر کو پردیسی کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''اس جذبے سے متاثر ہو کر فوراً بندوق کو ایک طرف رکھ کر اس نے سنگین اُتار دی اور اس کی نوک سے چنار کی ننگی چھاتی چھیلنے لگا۔ یہ ایذا ضرور ہے مگر اس ایذا کے پیچھے جو ابدیت ابھرنے والی ہو تو ایذا، ایذا نہیں رہتی۔ وہ اپنا نام کھودتا رہا کھودتا رہا۔ ایسی جگہ جہاں اس کی انفرادی شخصیت اوڑی کے تھانے کی طرح جُداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ کھودتے کھودتے اس سے یقین ہوتا جاتا تھا جیسے وہ اشوک بنتا جا رہا ہے، سلام آباد کا اشوک جیسے وہ اب کبھی نہیں مر سکتا'' [۲۰]

اس افسانے میں رحم علی کے فرض اور انا میں ایک جنگ ہوتی ہیں کہ کس طرح وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے چنار۔ کے پیڑ کو نقصان پہنچاتا ہے باوجود اس کے کہ اس درخت پر لکھنے کو حکومت نے پابندی بھی عائد کی تھی۔ دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو اس افسانے سے پولیس کا نظریہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کس طرح رحم علی نے سلام آباد میں بہت

دولت کمائی تھی، کچھ لوٹ مار سے اور کچھ رشوت سے جو کہ پولس کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔
اس میں تخیل آمیزی سے خیالی مناظر کو افسانوی رنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔



ان کوٹ:

''ان کوٹ'' پردیسی کے افسانوں میں شاہکار حیثیت رکھتا ہے جو ڈوگرہ دور میں لوگوں کے مصائب پر لکھا گیا ہے۔ افسانہ نگار کے مطابق مہاراجہ حکومت نے کشمیر میں ہمیشہ ایک مصنوعی قلعت پیدا کر کے انسانی تاریخ کی بدترین مثال قائم کی۔ اس قحط سالی کی ترجمانی اسی افسانے سے ہوتی ہے۔ ''ان کوٹ'' اصل میں اس دن کو کہتے ہیں جب مہاراجہ سال میں ایک بار لوگوں میں مفت اناج تقسیم کرتا تھا اور اپنی مصنوعی رحم دلی کا سکہ لوگوں پر بٹھانا چاہتا تھا۔ ''ان کوٹ'' میں لوگ چاول لینے آتے ہیں جہاں پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد صبح سے انتظار کرتی ہے لیکن حکومت کے کارندے اناج تقسیم کرنے کا وقت سورج ڈھلنے سے پہلے بتاتے ہیں اور لوگوں کے دن بھر کے انتظار کو پردیسی نے بہترن انداز میں بیان کیا ہے۔ اس دن کی منظر نگاری بھی کمال کی ہے۔

ایک بوڑھے کے گود میں بچہ دن بھر جاگتا رہا لیکن اناج بانٹنے کے وقت وہ سو گیا۔ اگر چہ بوڑھے نے اس کو بہت جگانے کی کوشش کی تھی لیکن جب وہ جاگ گیا تب تک ان کی باری چلی گئی تھی۔ جس پر وہ دوبارہ سپاہی کے پاس چلا گیا لیکن وہاں پر ڈوگرہ سپاہیوں نے اس کو بے رحمی سے پیٹا اور پھر گسیٹ کر باہر نکالا۔

اس افسانے میں مہاراجہ کے عملے، سپاہیوں اور تحصیل عملے کے کرداروں کی سراپا نگاری کی گئی ہے، کس طرح وہ عام لوگوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتے تھے۔ یہ افسانہ

انسان کو کشمیر کے ماضی کی بدترین تاریخ سے آگاہ کرتا ہے کہ کس طرح مظلوم کشمیری ظلم برداشت کرتے تھے۔ ''ان کوٹ'' میں پردیسی نے اچھوتے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ یہ ہماری سیاہ تاریخ کی اہم کڑی کے بطور پیش کیا جاسکتا ہے۔ پردیسی نے پہلے ''بتہ ہر'' کے عنوان سے کشمیری ڈراما لکھا تھا لیکن اس وقت کے گورنر نے ''بتہ ہر'' کو اسٹیج کرنے سے پہلے ہی ضبط کیا گیا۔ اسی لئے انہوں نے ''بتہ ہر'' کو ''ان کوٹ'' کے عنوان سے افسانہ لکھا ہے مختصراً ''ان کوٹ'' ہمیشہ کشمیر کے ماضی کی تلخ حقیقت کی یاد دلاتا رہیگا۔ اس افسانے کو صحیح تناظر میں پڑھنا بھی بہت کمال ہے ایک جگہ پردیسی لکھتے ہیں:

> ''قطار میں بیٹھے ہوئے وہ لوگ جن کی باری آنے والی تھی۔ اس کی بے مہری برداشت نہ کر سکے۔ اس سے باہر نکال دو حضور، ہماری باری پر گڑبڑ مچانے آیا ہے'' منشی کے اشارے پر دو مہاراجہ گارڈ آگے آئے اور اسے بری طرح سے پیٹتے ہوئے باہر دھکیل دیا'' [۲۱]



سوغات:

''سوغات'' پردیسی کا ایک بہت ہی طویل افسانہ ہے۔ ''سوغات'' ایک تواریخی اور جذباتی بنیادوں پر لکھا ہوا افسانہ ہے جس میں قدیم کشمیر بلکہ برصغیر کے تاریخی نوعیت کے اہم واقعات ہیں۔ اس افسانے میں ماں کے پیار، جذبات اور احساسات کی بھی خوب ترجمانی کی گئی ہے۔ نیل کنٹھ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے جو کسی کام سے روالپنڈی جانا چاہتا ہے جبکہ ماں اس کو یہ کہہ کر روکتی ہے وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آخر کار بیٹے نے ماں

کو منا لیا۔ ماں ہمیشہ زمانے کو کلجگ اور بیٹا ترقی یافتہ تصور کرتا ہے۔ اسی دوران بیٹا اپنی ماں کی فرمائش پر کوئی تحفہ لانا چاہتا ہے لیکن ماں ہر بار منع کرتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس وہ بہو اور اس کے بچوں کے لیے کپڑے اور دوسرے چیزوں کی فرمائش کرتی ہے۔ آخر کار نیل کنٹھ یہ کہہ کر گھر سے نکلتا ہے کہ اب وہ خود ہی ماں کے لئے تحفہ لائے گا۔ پندرہ دن گزر گئے اور نل کنٹھ واپس آ گیا۔ لیکن اب وہ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے وہ دیکھا تھا جس کا اس نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ ترقی یافتہ شہر کی چکا چوند نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ کشمیر کو راکھشستوں کا شہر کہتا تھا اگر چہ ماں کشمیر کو بھگوانوں کا دیس کہتی تھی۔ بیٹا کہتا کہ بھگوان گندگی میں نہیں رہتا بلکہ وہ پنڈی اور دہلی جیسی خوبصورت جگہوں پر رہتا ہے۔ ماں جنگ و جدل کو انسانی ترقی میں روکاٹ سمجھتی ہے جبکہ نیل کنٹھ جنگ کو انسانی ترقی کا ضامن قرار دیتا ہے۔ بیٹے نے رام اور راون کی مثالیں پیش کی اور ماں چپ ہوگئی اس کے بعد پھر بیٹے نے کورووں اور پانڈوں کے جنگ کی روداد سنائی اور کہا کہ پہلے جنگ شطرنج پر عورتوں کو داو پر لگا کر کی جاتی تھی اب لڑائیاں دولت اور ملکوں کے تقسیم پر ہوتی ہیں۔ ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ''انسان جوں جوں ترقی کرتا جائیگا اسے پھیلاوٗ کے لیے دنیا سمٹتی ہوئی سی''، سکڑتی ہوئی سی دکھائی دے گی''۔ ۲۲

یہ جملہ مصنف کے وسیع نظر کی دلالت پیش کرتا ہے۔ افسانے میں مذہبی تصورات کو کھل کر پیش کیا گیا اور کھل کر تنقید بھی کی گئی۔ اور پھر جب تحفہ دیکھنے کی باری آئی تو نل کنٹھ نے وہ سب لایا تھا جو ماں نے کہا تھا اور آخر کار سوغات کی باری آتی تو نیل کنٹھ نے لفافہ کھولہ اور ماں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ کیوں کہ اس میں ماں کے آخری رسوم کے لیے کفن تھا۔ ماں نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا کہ ''میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ہوں'' اور اس

، جو ہون کو بھگوان کے ساتھ ایک سودا سمجھتا تھا۔ رام ناتھ اس ہون اور بھوگ کو دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کا راز سمجھتا تھا اور اس کے مطابق جس شخص نے یہ بھید نہیں جانا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جس طرح اس کے پرانے کاریگر تھے وہ تب بھی کاریگر ہی تھے اور آج بھی کاریگر ہی ہیں ۔ اس کی وجہ تسمیہ یہی تھی کہ ان کو بھگوان خوش رکھنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ افسانے میں دوسری طرف بھکاریوں کی حالت زار کی عکاسی ہوتی ہے۔

افسانے کا پلاٹ بے حد متاثر کن ہے جو کشمیر کے غریب عوام کی بے بسی اور لاچاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ افسانے میں کمال کی منظر نگاری کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد برے رسومات کا قلع قمع کرنے کو جی چاہتا ہے جو افسانہ نگار کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ بھوک اور ہَون کی آگ کا نقشہ پردیسی کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''اندر شامیانے کے نیچے اونچی آواز میں شانتی پاٹھ ہو رہا تھا اور باہر ایک مضطرب اور مجبور ماں اپنے بھوکے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی صحن سے نکل رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر رک رک کر مڑ مڑ کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دیوتا نہیں آئے جو اتنی بڑی تقریبوں پر سب سے پہلے بھات اور پکوان کھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بے زبان بھوکے بچے سے بھی پہلے!
>
> وہ گویا ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہی تھی دیوتا کہاں ہیں؟ دیوتا کہاں ہیں؟'' (بچے نے کہا)......۲۸

☆☆☆

امام صاحب:

''امام صاحب'' ایک بوڑھے مفلس انسان کی داستانِ غم ہے جس کی کسمپرسی کو نہایت فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ امام صاحب نے اپنے آنگن میں ایک چھوٹی سی مسجد شریف تعمیر کروائی، جس میں شہر کے چند دوکاندار، بینک کے کچھ ملازم اور کچھ ہمسایہ نماز جمعہ ادا کرنے آتے ہیں اور نماز کے بعد امام صاحب ایک چغہ، جو اس کو ورثے میں ملا تھا، ایک کھونٹی پر رکھتا ہے۔ نماز کے بعد لوگ اس چغے کے جیبوں میں چند پیسے ڈالتے ہیں اور امام صاحب کا ہفتے کا خرچ نکل آتا ہے۔ ساتھ ہی امام صاحب کی ایک بیٹی مہری ہے جو صرف ایک بچہ جننے کے بعد ہی بیوہ ہوگئی۔

ایک روز صبح بہت بارش ہو رہی تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ پوری مسجد میں پانی ٹپک رہا تھا اور نمازیوں کا آنا مشکوک لگ رہا تھا۔ مہری اور امام صاحب آسمان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ موسم کے تیور دیکھ کر مہری نے مسجد کے ٹاٹ کھڑے کر کے رکھ دیئے لیکن اللہ کا کرم تھا کہ گیارہ بجے کے قریب آسمان سے بادل صاف ہوگئے بارش بھی رک گئی۔ مہریؔ نے بھی مسجد میں چٹائی بچھائی۔ امام صاحب نے حسبِ معمول نماز جمعہ پڑھائی اور ساتھ ہی چغے کو بھی کھونٹی پہ لٹکا کے رکھا۔ اس دن بھی لوگوں نے چغے کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تھے لیکن کچھ لوگ ویسے ہی چلے گئے جن کی طرف امام صاحب دور تک حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے کہ شاید وہ واپس آجائیں۔ اس بار امام صاحب کچھ مایوس تھے کیونکہ ایک تو کم لوگ نماز ادا کرنے آئے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ چغے کا ایک طرف کا جیب بالکل ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹٹولنے پر دیکھا کہ ایک جیب سے تین روپے اور ساڑھے بارہ آنے نکلے اور دوسری جیب سے ایک بہت بڑا نوٹ نکلا جو امام صاحب نے

اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔نوٹ دیکھ کر امام صاحب اور اسکی بیوہ بیٹی بہت پریشان ہوگئے، پہلے تو انہوں نے اس کو کسی مرید کا کھوٹا سکہ ٹھہرایا اور کبھی وہ اسے دشمنوں کی چال قرار دے رہے تھے لیکن کافی سوچنے کے بعد امام صاحب کو اپنا ایک مرید یاد آیا جو کہ بینک میں ملازم تھا۔ جب امام صاحب نے یہ بڑا نوٹ اس کو دکھایا، تو اس نے امام صاحب کو بتایا کہ یہ نوٹ نقلی نہیں بلکہ اصلی سو روپیہ کا نوٹ ہے۔ پہلے تو امام صاحب کو یقین نہیں آیا لیکن جب بینک کے ملازم نے اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ کے سو نوٹوں کا بنڈل تھما دیا تو امام صاحب کو یقین کرنا ہی پڑا۔ گھر پہنچ کر امام صاحب نے اپنی بیٹی سے کہا کہ اگر کوئی مجھے ڈھونڈنے آئے تو کہنا کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے اور دو تین دنوں کے بعد آئیگا۔ پھر امام صاحب پچھلے کمرے میں چلے گئے اور کمبل اوڑھ کر نوٹ گننے لگے۔

اس افسانے میں پردیسی نے مفلسی کی انتہا کو اپنے فن سے بہترین انداز میں پیش کیا اور ساتھ ہی انگریزوں کے دور کی تباہ حالی کو بھی پیش کیا۔

افسانے کا ٹریٹمنٹ بہترین ہے جس میں انسان کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ اسلوب بھی نہایت سادہ ہے، دلچسپ انداز کا یہ افسانہ پردیسی کے فن کے عروج کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ افسانہ طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔

> "امام صاحب نے جوتی اتار دی۔ لاٹھی ایک طرف کو رکھ دی اور کھڑکی کے برابر بیٹھ گئے انہیں بہت ملال تھا کہ کچھ نمازی چوغے کا خیال کیے بغیر ہی چل رہے تھے، ایسے لوگوں کو نہ خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ اوروں کی مفلسی سے ہمدردی۔ مگر یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، دنیا نفسا نفسی کا دوسرا نام ہے" [۲۵]

☆☆☆

جھنجھنا:

''جھنجھنا'' مصنف کا مزاحیہ لہجے میں لکھا ہوا اپنی نوعیت کا پہلا افسانہ ہے۔ ''جھنجھنا'' ایک پنڈت گھرانے کی کہانی ہے جس پر بھگوان نے تمام نعمتوں کا نزول کیا تھا۔ اس گھر میں امن واشتی، اتحاد اتفاق اور ایک دوسرے کی فرماں برداری نے جیسے ڈیرا ہی ڈالا تھا۔ اس پنڈت گھرانے میں تین بھائی تھے۔ بڑا بھائی واسودیو، جس کا کام دن بھر گاؤں میں آوارہ گھومنا تھا، گاؤں میں ہر فتنے اور لڑائی کے پیچھے واسودیو کا ہاتھ ضروری ہوتا تھا۔ اس کے بعد آفتاب رام تھا، جس کی ایک دوکان تھی لیکن آفتاب رام شرافت سے کم اور گالی گلوچ سے زیادہ کام لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی گنگا دھر تھا، جو شہر میں نوکری کرتا تھا اور آج وہ ٹھیک چار مہینے کے بعد شیوراتری کا تہوار منانے گھر آیا تھا۔ گنگا دھر بہت ہی فرمانبردار اور مخلص تھا اور ہر مہینے کی تنخواہ گھر بھیجتا تھا۔ گھر کا ماحول اس طرح کا تھا کہ چار مہینے کے بعد لوٹنے پر بھی وہ اپنے بیٹے کو گلے نہیں لگا سکا۔ اگر چہ بچے نے اپنے باپ کو پہچان بھی لیا تھا لیکن گنگا دھر کہاں سے وہ شکتی لاتا اور اپنے بڑے بھائیوں کے سامنے اپنے بیٹے کو گلے لگاتا لیکن جب وہ شام کو اپنے کمرے میں چلا گیا تو اس نے اپنی بیوی اور بچے کو بہت پیار دیا اور اندر کی جیب میں رکھا ہوا جھنجھنا بھی بیٹے کو دیا اور اپنی بیوی کو چیزوں کے بدلے میں دو روپیہ کے نوٹ سے خوش کیا لیکن اس پر گنگا دھر نے بہت ہی تلقین سے اپنی بیوی کو سمجھایا ان چیزوں کے بارے میں کسی بھی گھر والے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن مصیبت کب پوچھ کے آتی ہے اسی صبح اپنے بڑے بھائی کے پیروں کے سامنے بیٹھا تھا، کہ اتنے میں گنگا دھر کے بیٹے نے سب کی نظروں سے بچا کر جھنجھنا نیچے لایا اور سب کو دکھایا لیکن اتنی سی بات تھی کہ عورتوں نے سینہ پیٹنا شروع کیا اور سبھی لوگ حیران و پریشان ہوئے اور واسودیو کا غصہ

آسمان چڑھنے لگا اور حقہ پیتے پیتے زہریلے لہجے میں کہا کہ لونڈے کو شہر کی ہوا لگ چکی ہے اور اب اس گھر میں اتفاق قائم نہیں رہ سکتا۔ تین دن تک گنگادھر کے ساتھ کسی نے بات تک نہیں کی اور چوتھے دن وہ صبح سویرے گھر سے نکل کر شہر کی طرف چل دیا اور اسطرح معمولی جھنجھنے نے گنگادھر کی عزت گھر کے اتحاد و اتفاق اور فرمانبرداری کو مٹی میں ملا دیا۔

افسانے میں کئی واقعات پیش کئے گئے ہیں جن سے سماج کے مختلف طبقوں اور اموارات کی واضح نشاندہی ہوتی اور حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ مختصراً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ افسانہ ہماری وادی کے پنڈت طبقے کا بہترین عکاس ہیں۔



بہتے چراغ:

''بہتے چراغ'' پریم ناتھ پردیسی کے آخری افسانوی مجموعہ کے آخری افسانے کا نام ہے۔ افسانہ میں جنگ اور امن کی دائمی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ افسانے میں کشمیر کے سیاحتی ماحول اور سرگرمی کے ساتھ ساتھ دوسری عالمگیر جنگ کے اثرات کی تباہ کاریوں کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ''پرپھول'' ہے، جو فوج کا کپتان ہوتا ہے۔ جس نے فوج میں بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ فوج سے بہت تنگ آچکا ہے کیونکہ اس نے بہت نزدیک سے جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھا ہے کہ کس طرح جنگ سے کھیتوں کے کھیت اور ملکوں کے ملک تباہ ہوتے ہیں اور انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں اور اسی لیے ''پرپھول'' جنگ سے لوٹ کر اپنی بیوی نلنی کے ساتھ کشمیر میں چھٹیاں منانے آتا ہے۔ اس کے بغل والے ہاؤس بوٹ میں ایک بمبئی کا سیٹھ اپنے درجن بھر بچوں اور بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ سیٹھ ہمیشہ چاہتا ہے کہ دنیا میں جنگ جاری رہے۔

کیونکہ اس نے پچھلی جنگ میں لاکھوں روپیہ کمائے ہیں۔ پرپھول اور سیٹھ کے مابین ہمیشہ اس موضوع پر بحث ہوتی۔ افسانے میں ملہ قادر ہانجی پرپھول اور اس کی بیوی نلنی کو کشمیر میں امن اور آپسی بھائی چارے کے قصے سناتا ہے۔ جس میں لل دید، شیخ العالم اور حبہ خاتون کی کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ ملہ قادر کے برتاؤ نے بنگالی جوڑے پر ایک چھاپ ڈال دی تھی۔ اسی اثنا میں ملہ قادر نے نلنی کو دریا میں گھی کے چراغ جلانے کا بھید بھی بتایا کہ جو بھی شخص عقیدت کے ساتھ چراغ جلا کر ڈل میں ڈالتا ہے اس کے من کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ اس پر پہلے نلنی کو یقین نہیں ہوا لیکن بعد میں اس نے ملہ قادر کو اپنی دیرینہ خواہش بتائی کہ شادی کے چھ برس ہونے کے بعد بھی اس کی کوک نہیں بھری۔ جس پر ملہ قادر نے اس کو گھی کے چراغ جلانے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ کپتان نے نلنی کے اس کام پر اس کا بہت مذاق اڑایا لیکن اس نے طے کیا کہ وہ بالکل ٹھیک شام کو گھی کے چراغ جلائے گی۔

یہ بات جب سیٹھ نے سنی تو اس نے بھی گھی کے چراغ منگوا کر ڈل میں ڈال دیئے تاکہ دنیا میں جنگ قائم ہو اور امن کبھی نہ قائم ہو سکے۔ لیکن پرپھول کو جب پتہ چلا کہ سیٹھ نے بھی جنگ کی خاطر چراغ جلائے تو اس نے چھت سے ہی اس کے چراغ پر اپنے پستول سے نشانہ سادھا۔ چراغ بجھ گیا اور دریا میں ڈوب گیا۔ جس پر سیٹھ نے پرپھول کو بہت گالیاں دیں اور پرپھول اپنے چھت پر ہنستا رہا۔ اور آخر میں کہہ دیا کہ سیٹھ دنیا کو جنگ کی نہیں امن کی ضرورت ہے اور اب جنگ کے چراغ نہیں جلیں گے۔

جنگ اور امن کے علاوہ یہ افسانہ ہم کو کشمیری تہذیب اور عقیدت کے بارے میں روشناس کراتا ہے۔ مثلاً اس افسانے میں پردیسی بوڑھے ہانجی ملہ قادر کا تعارف کچھ اس طرح سے دیتے ہیں:

''اس دوران ملہ قادر پرپھول اور اس کی بیوی کی زندگی کا ایک اہم جز

بن گیا۔ وہ انہیں ہر شام کشمیر کے ماضی کی کہانیاں سناتا۔ بڈشاہ اور للتادتیہ کی کہانیاں، لالہ عارف اور شیخ العالم کی کہانیاں حبہ خاتون اور ارنہ مال کی کہانیاں۔ وہ کہانیاں جن میں محبت ہی محبت اور امن ہی امن ہے چنانچہ ساٹھ سالہ بوڑھا بھی انہیں اوپر سے نیچے تک امن اور محبت کا مجسمہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے دل میں غریبی کے باوجود لالچ نہیں وہ جو کچھ بوٹ کے کرائے سے کماتا اس پر قانع تھا۔"[۲۶]



دیگر افسانے

(جو افسانوی مجموعوں میں شامل نہیں ہیں)

اس کے علاوہ بہت سے ایسے افسانے ہیں جو کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے ہیں لیکن بڑی عرق ریزی سے خاکسار نے ان کو مختلف اخبارات ورسائل کی پرانی اور گرد آلود فائلوں سے حاصل کیا ہے۔ جن میں یہ افسانے شامل ہیں۔

نمبر	افسانہ	تاریخ	رسالہ
1-	کیچڑ کا دیوتا	مئی ۱۹۴۶ء	ماہنامہ ساقی
2-	خون اور سکّے	یکم جولائی ۱۹۴۷ء	ماہنامہ آج کل
3-	ذبح خانہ	مارچ اپریل ۱۹۵۲ء	ششماہی شاہراہ
4-	ڈاک گھر کے پاس	جون ۱۹۴۵ء	ماہ نامہ ہمایوں
5-	آنسو اور چھری	اپریل ۱۹۵۱ء	ماہنامہ شاہراہ
6-	بنفشہ کے پھول	جنوری فروری ۱۹۵۴ء	سالنامہ شاہراہ
7-	سوال	اکتوبر ۱۹۴۵ء	ہمایوں ماہ نامہ
8-	ایک پیسہ	جولائی اگست ۱۹۵۲ء	شاہراہ
9-	پتری جنم	۱۹۸۹ء	ہفتہ روزہ رنبیر
10-	جوارنی	۱۷/مئی ۱۹۸۹ء	ایضاً

11-	ناکام مصور	۱۸ جیٹھ ۱۹۸۹ء	رنبیر جموں
12-	شاعر کی شادی	۲۶، بیساکھ ۱۹۸۹ء	ایضاً
13-	جنازے	۱۴/ بھادوں ۲۰۰۰ء	ایضاً
14-	معمہ	مئی ۱۹۴۴ء	ایضاً
15-	کیا پایا کیا کھویا		ایضاً
16-	آتشین لمحے		ایضاً
17-	دو آنسو	۷ ساون ۱۹۸۹ء	رنبیر۔ کرشن نمبر خاص
18-	مدفون خزانہ	۲۸/ بیساکھ ۱۹۸۹ء	ایضاً
19-	بیگار	۸ بھاگن ۱۹۹۵ء	رنبیر جموں
20-	سچی پرارتھنا	۱۱/ اپریل ۱۹۳۹ء	ایضاً
21-	نقاب پوش حسینہ	۲۲ چیت ۱۹۸۹ء	ایضاً



افسانوں کے تذکرے

(برج پریمی نے جن افسانوں کا تذکرہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں)

نمبر	نام افسانہ	تاریخ۔ صفحہ	ماہنامہ/ روزنامہ/ رسالہ
1-	آنسو اور چھری	اپریل ۱۹۵۱۔ ص ۶۱	ماہنامہ شاہراہ
2-	بنفشہ کے پھول	سالنامہ جنوری فروری ۱۹۵۴ء	ایضاً
3-	وہ تینوں	ترقی پسند نمبر جلد ۱۹ نمبر ۵۔ ۶	ماہنامہ شاہکار لاہور
4-	بزدل	افسانہ ایڈیشن ۱۹۳۲ء	روزنامہ سیلاب
5-	سچی پرارتھنا	اپریل ۱۹۳۲ء۔ ص۔ ۳۶	ہفتہ روز نیر
6-	مدفون خزانہ	۱۹۳۲ء صفحہ ۳۰	ایضاً
7-	ناکام مصور	مئی ۱۹۳۳ء۔ ص۔ ۳۳	ایضاً
8-	کیچڑ کے دیوتا	۱۹۴۶ء مئی	ساقی
9-	پل	۱۹۴۶ء مئی	ساقی
10-	پارے کی پوتی	۱۹۴۶ء	ساقی

11- دیہاتی گیت	جنوری ۱۹۳۶ء	ایضاً
12- تمھارا گھر	جنوری ۱۹۳۶ء	ایضاً
13- حسین موت	ایضاً	ایضاً
14- پوجاری	ستمبر ۱۹۳۶ء	ایضاً
15- تم	جنوری ۱۹۳۶ء	ایضاً
16- ملنے کے دن	اکتوبر ۱۹۳۶ء	ایضاً
17- ایک کشمیری گیت	مئی ۱۹۳۵ء	ایضاً
18- دو آنکھیں	اگست ۱۹۳۵ء	ایضاً
19- برہمن کے گیت	نومبر ۱۹۳۵ء	ایضاً
20- پھول	دسمبر ۱۹۳۵ء	ایضاً
21- سازش	جنوری ۱۹۳۹ء	ماہنامہ شاہکار لاہور
22- ہائے دنیا	فروری ۱۹۳۹ء	ایضاً
23- نابینا گویا	ستمبر ۹۳۹ء	ایضاً
24- بن مالا	جون ۱۹۳۶ء	روزنامہ میلاپ
25- اپنے چاند سے	مارچ ۱۹۳۴ء	روزنامہ کرم ویر
26- نیا گیت	ڈسمبر ۱۹۳۴ء	میلاپ لاہور
27- ایک رات	بست نمبر ۱۹۳۷ء	ایضاً
28- بڑا دل	ستمبر ۱۹۳۶ء	ایضاً
29- پہلا تیر	۲۹ ستمبر ۱۹۳۵ء	ایضاً

30-	رانی کا مندر	ستمبر ۱۹۳۵ء	پریم ناتھ پردیسی: عکس در عکس ایضاً چار افسانہ نویسوں کا لکھا ہوا افسانہ۔ پردیسی۔ رنبیر۔ امپریشن۔ اور بن بائی کا لکھا ہوا مشترکہ افسانہ
31-	اس پار	اپریل ۱۹۳۶ء	ایضاً
32-	رادھا کا ہار	۱۹۳۷ء	رنبیر جموں۔
33-	بابا جی	مئی ۱۹۳۶ء	میلاپ لاہور
34	سنگم	فروری ۱۹۳۶ء	ایضا
35-	شہید کے مزار پر	دسمبر ۱۹۳۴ء	ایضاً
36-	بغاوت کی سزا	دسمبر ۱۹۳۷ء	روزنامہ مارتنڈ
37-	چند خطوط	جنوری ۱۹۳۸ء	ایضاً
38-	موت کا خواب	جنوری ۱۹۳۸ء	ایضاً
39-	اندر اور باہر	دسمبر ۱۹۳۷ء	ایضاً
40-	آواز	ایضاً	روزنامہ مارتنڈ
41-	جے ہنومان	فروری ۱۹۳۸ء	ایضاً
42-	حسنیٰ	۱۹۳۸ء	ایضاً
43-	مرگھٹ	۱۹۳۸ء	ایضاً
44-	فنا کا رقص	۱۹۳۸ء	ایضاً
45-	سندھیا کا شراپ	اپریل ۱۹۳۸ء	ایضاً

46-	اُجرت	اپریل ۱۹۳۸ء	ایضاً
47-	چتائیں	جنوری فروری ۱۹۴۲ء	ماہنامہ بہار کشمیر لاہور
48-	روندی ہو کلیاں	مارچ ۱۹۴۲ء	ایضاً
49-	روندی ہوئی کلیاں	جولائی ۱۹۴۲ء	ایضاً
50-	افسانہ	ستمبر ۱۹۳۴ء	میلاپ لاہور
51-	یتیم کے آنسو	ستمب ۱۹۳۶ء	میلاپ لاہور
52-	اُجڑے مندر کے باہر	ستمبر ۱۹۳۶ء	میلاپ کرشن نمبر ا



حوالہ جات

۱: شام وسحر۔ پریم ناتھ پردیسی، ص ۸۔۷، ۱۹۴۱

۲: شام وسحر۔ پریم ناتھ پردیسی، ص ۱۳، ۱۹۴۱

۳: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار۔ برج پریمی۔ ص ۸۴

۴: راجو کی ڈولی (افسانہ)، از شام وسحر، ص ۲۲

۵: چونی (افسانہ)، از شام وسحر، ص ۶۴

۶: انسان ساز (افسانہ)، از شام وسحر، ص ۱۰۷

۷: پیش لفظ...... ''دنیا ہماری''۔ پریم ناتھ پردیسی، ص: ۱۶

۸: اگلے سال (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص ۱۴۱

۹: میرا حق (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص ۵۱

۱۰: میرا حق (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص ۶۴

۱۱: اکتشاف واستدلال، مرتبہ، مصرہ مریم، ص: ۱۸۰

۱۲: کاریگر (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص؛ ۱۰۱

۱۳: سائڈلاین (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص: ۱۲۰

۱۴: چتائیں (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص؛ ۱۶۹

۱۵: لباس تلے (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص؛ ۱۸۲

۱۶: پردیسی: عہد، شخص اور فنکار، از برج پریمی، ص؛ ۹۷

۱۷: پیش لفظ از احتشام حسین، بہتے چراغ، ص: ۱۴۔۱۳

۱۸: پیش لفظ از احتشام حسین، بہتے چراغ، ص: ۱۴۔۱۳

۱۹: ڈھول (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۳۱

۲۰: ڈھول (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۹۲

۲۱: ان کوٹ (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۱۰۴

۲۲: سوغات (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۱۱۲

۲۳: سیلز مین (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۱۲۳

۲۴: دیوتا کہاں ہے (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۲۱۷

۲۵: امام صاحب (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۲۳۸

۲۶: بہتے چراغ (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۲۹۰

☆☆☆

پردیسی بحیثیت شاعر

اردو شعروادب کی تاریخ میں کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی خدمات اپنی اہمیت رکھتی ہیں۔حق تو یہ ہے کہ کشمیریوں کی خدمات کا تذکرہ کیے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل ہی نہیں کی جاسکتی۔ کشمیر میں شعراء کی تعداد اگرچہ زیادہ ہے لیکن شعری مزاج کو سمجھنے کے لیے ان کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے دور مین ان شعراء کا نام لیا جاسکتا ہے جو بیسویں صدی کے آغاز تک شاعری کرتے رہے۔ ان میں اکثر و بیشتر کا ذکر ''گلشنِ کشمیر'' کے تذکروں میں ملتا ہے اگر چہ یہ شعراء روایتی انداز میں ہی لکھتے تھے۔ان میں پنڈت ہر گوپال خستہ، صادق علی، مرزا مبارک بیگ، مرزا سعید بن سعید، راجہ شیر علی خان، تاراچند ترسیل، کاشی ناتھ ترسیل، خوشتر خانصاحب، منشی سراج الدین، چودھری خوشی محمد ناظر، قمر قمرازی، ڈاکٹر عمادالدین سوز، حبیب کیفوی، قیس شروانی، وشوناتھ ورما، اللہ رکھا ساغر، نرسنگھ سہائے شوق وغیرہ قابل ہیں۔اس دور میں کئی شعراء نے موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں اور یہ نظمیں زیادہ تر نظیرا کبر آبادی، آزاد اور حالؔی کی نظموں کے زیر اثر لکھی گئیں ہیں۔

دوسرے دور میں جو شعراء سامنے آتے ہیں ان میں اثر صہبائی، طالبؔ کاشمیری ،شہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکی، دینا ناتھ مست، منوہر لال، رساؔ جاودانی، فطرت کاشمیری، کشن سمیل پوری، غ۔م۔ طاؤس، عبدالغنی فاضلی، عبدالحق

برق اور پریم ناتھ رونق (پردیسی) وغیرہ خاص شامل ہیں۔ اس دوسرے دور کے شعراء میں دورِاول کے شعراء کے نسبت فنی شعور میں زیادہ پختگی اور رچاؤ ہے۔ عام طور پر اس دور کے شعراء میں حیات وکائنات کو سمجھنے کے واضح رجحانات نظر آتے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی دوسرے دور کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی شعروشاعری سے کیا لیکن شعر گوئی کو پردیسی نے بہت ہی جلد ترک کردیا۔ پریم ناتھ پردیسی کی شاعری کے بارے میں قیصر قلندر کہتے ہیں:

> ''پردیسی شعروشاعری سے مس (شغف) رکھتے تھے۔ بے شمار شعر یاد تھے۔ شروع شروع میں چھوٹی چھوٹی نظمیں اور غزلیں لکھیں لیکن راہ شعر کو دشوار گذار پاکر خیابانِ نثر کو ہی اپنایا اور کئی دیدہ زیب ودل فریب پھول کھلائے اور اردو افسانے کو ہی نہیں بلکہ اردو ڈرامے کو بھی مالا مال کیا۔'' [1]

شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک طرح کی صناعی بھی ہے۔ شاعر اپنے تخیل کی بنیاد پر جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ بقول محمد فضل الدین:

> ''اسے زبان میں تناسب، موزونیت اور توازن کا اسی قدر خیال رکھنا ہوتا ہے جتنا کہ بُت تراش کو مجسمہ بنانے میں۔'' [2]

پریم ناتھ پردیسی کا تخلیقی میلان زیادہ تر افسانہ کی طرف ہی رہا جبکہ اصل میں انہوں نے پہلے پہل ''رونق'' تخلص اختیار کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنے تحقیقی مضمون ''پریم ناتھ پردیسی اور اس کا تخلیقی ذہن'' میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

> ''کشمیر کے ادیبوں میں پریم ناتھ پردیسی بڑی دلچسپ اور رنگا رنگ

شخصیت کے ملک تھے۔ وہ افسانے لکھتے رہے۔ ادب لطیف سے
بھی انہیں گہرا شغف رہا اور شاعری میں بھی انہوں نے اپنی طبیعت
کے جوہر آزمائے لیکن اس میدان میں بھی اس کی طبیعت چمک نہ
سکی۔ کشمیر کے اخباروں کے اجراء اور پریس کے قیام کے بعد ہی
پردیسی اور دوسرے کئی ادیبوں اور شاعروں کے ادبی افکار منظرِ عام
پر آنے کے لیے راہیں ہموار ہوگئی تھیں۔'' [۳]

پریم ناتھ پردیسی نے کشمیریوں کی آواز زیادہ تر اپنے افسانوں کے ذریعہ باقی دنیا تک پہنچائی۔ اس سے قبل وہ شاعری کے ذریعے سے اپنا موقف پیش کرتے تھے۔ پردیسی اپنے ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

''میں ان دنوں چھوٹا تھا اور دادا جان کی چلم پر آگ رکھنے کی ڈیوٹی
میرے ذمہ رکھی گئی تھی۔ میں ایک کمرے میں بیٹھا ان بزرگوں کی
بحثیں توجہ اور دلچسپی سے سنا کرتا اور متاثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا
تھا کہ کہانی لکھنا کیا مشکل کام ہے میں ضروری کہانیاں لکھوں گا مگر
دوسری مجلس میں جب شاعری پر بحث ہوتی تھی اور تڑپانے والے
شعر سنائے جاتے تھے۔ تو میرا ارادہ بدل جاتا اور میں شاعر بننے کی
خواہش کرتا ہوں۔'' [۴]

پردیسی جب بالکل چھوٹے تھے تب ان کے دادا مکند کول اپنے گھر میں شعرو ادب کی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ جن میں ریاستی اور بیرونی سطح پر ہورہی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی پریم چند اور ان کے افسانے موضوع بحث بن جاتے تو کبھی اقبال

کی شاعری۔ غرض اس طرح سے ان محفلوں میں دل کو چھو لینے والی کہانیاں بھی پیش کی جاتی تھیں اور لہو کو گرمانے والے شعر بھی کہتے جاتے تھے۔ ان ہی محفلوں کی صحبت میں پریم ناتھ پردیسی کی تخلیقی زندگی پروان چڑھی۔

پریم ناتھ پردیسی نے ۱۹۲۴ء سے باضابطہ شاعری کا آغاز کیا۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک میں نے شاعری کی لیکن بعد میں اس سے نفرت ہوگئی اور کہانیوں کی طرف مائل ہوگیا۔" ۵

اس میں دو رائیں نہیں کہ پردیسی اخیر عمر تک منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے شعر کہتے رہے۔ اس بارے میں سروری رقمطراز ہیں:

"پردیسی کی ادبی زندگی کا آغاز بھی ان کے بہت سے معاصر شاعروں اور ادیبوں کی طرح شعر و سخن کی دلچسپیوں سے ہوا۔ وہ غزل کہتے تھے اور بعد میں کچھ نفیس نظمیں بھی کہیں تھی جن میں بچوں کے لیے بھی کچھ نظمیں شامل ہیں۔ اس زمانے میں ان کی نظمیں اور غزلیں رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتی رہتی تھی۔ ابتدائی دَور میں غزل کی دلچسپیاں انہیں بھی محصور رکھتی ہیں۔" ٦

اس زمانے میں کشمیر میں صحافت کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ریاست کے کچھ ادیبوں نے باہر کے اخبارات کی طرف رجوع کیا اور اپنی تخلیقات کو شائع کروانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانے میں لاہور سے ایک اخبار کشمیر کے ایک پنڈت نوجوان نے نکالنا شروع کیا۔ جس کا نام پنڈت گوپی ناتھ گورٹو کو تھا اور چونکہ کشمیر میں صحافت

پر پابندی تھی تو کشمیر کے چند پنڈت ادیب نوجوانوں نے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے اسی اخبار کا سہارا لیا۔ اور بعد میں ان نوجوانوں میں کئی باصلاحیت شاعر بھی سامنے آئے ان میں خاص طور پر نند لال طالب، زندہ کول ماسٹر جی، دینا ناتھ مست، دینا ناتھ شاہد، تارا چند ترسیل، شیام لال ولی تیرتھ، نند لال بے غرض، مہیشور ناتھ مست، شنکر ناتھ صغیر، شام لال انبر قابلِ ذکر ہیں۔ اخبار عام لمبی تقطیع کے کاغذ پر شائع ہونے والا ہفت روزہ تھا۔ جس میں کشمیر کے لیے کئی صفحات مخصوص تھے۔ پریم ناتھ پردیسی نے اسی اخبار سے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس بارے میں برج پریمی لکھتے ہیں:

> ''پریم ناتھ پردیسی نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات ''اخبار عام'' کے ان ہی کالموں سے کی۔ وہ ''رونقؔ'' تخلص کے ساتھ اپنی شناخت کروانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگے اور اسی نام سے ان کا ابتدائی کلام اخبارِ عام میں شائع ہونے لگا۔ اس زمانے کی شاعری کے نمونے دستیاب نہ ہوسکے البتہ شروع کے دور کے چند شعر یوں ہیں۔'' ۷

کوئی ارماں نہ نکلا بے بقا گلزارِ دنیا میں
کلی پژمردہ دل کی رہ گئی وقفِ خزاں ہوکر

کہاں تک دور ہو رونقؔ میرا جنت کشِ ہستی
کوئی اپنے خبر گیر کو مرگِ ناگہاں ہوکر

چونکہ پردیسی کا زیادہ کلام پاکستانی اخبارات میں شائع ہوتا تھا، اس لیے ان کا

حصول کافی مشکل تھا۔ جو چند نظمیں ملیں ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ بعد کی ہیں۔ پردیسی ان دنوں بچوں کے لیے لکھتے تھے، اسی دوران پردیسی کی ملاقات لالہ ملک راج صراف جیسی بلند قامت شخصیت سے ہوئی۔ جنہوں نے انہی دنوں جموں میں ہفتہ روزہ ''رنبیر'' شروع کیا تھا۔ پردیسی نے رونق کے قلمی نام سے ''رنبیر'' میں لکھنا شروع کیا اور جلد ہی بحیثیت معاون اخبار کے ساتھ جڑ گئے۔ اس بارے میں خود ایک جگہ پردیسی لکھتے ہیں:

> ''اسکول کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ''رنبیر'' کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ تب میں پھر اس کے لیے لکھنے لگا۔۔۔ چند نظمیں موزوں کی۔ جن کو شری ملک راج صرف نے مناسب اصلاح کے بعد اپنے اخبار میں شائع کیا اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی''۔[8]

۱۹۳۳ء میں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے پہلا روزنامہ ''وِتستا'' جاری کیا۔ پردیسی ''رونق'' نام سے اس کے مستقل قلمکار بن گئے۔ بعد میں جب انہوں نے دوسرا اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا جس نے صحافتی حلقوں میں دھوم مچادی تو رونق ان سبھی اخبارات کے لیے بحیثیت مستقل کالم نویس جڑ گئے۔ ساتھ ہی اخبار کے ادبی ایڈیشن بھی ترتیب دینے لگے۔ روزنامہ ''وِتستا'' میں چھپی یہ غزل ملاحظہ ہو:[8]

نگاہِ مست اُن کی خوب پُرتاثیر ہوتی ہے
کہ بیمار محبت کے لیے اکسیر ہوتی ہے

اثر لاتی ہے دنیا میں دعائے خیر بھی اُلٹا
بشر کی جب کبھی روٹھی ہوئی تقدیر ہوتی ہے

لکھا نامہ میں اس وعدہ شکن کو میں نے بس اتنا
میری ہمراز فرقت میں تیری تقدیر ہوتی ہے

جو ان کی بزم میں ہم بھولے بھٹکے جا نکلتے ہیں
بہت بیدار ہوتی ہے بہت تحقیر ہوتی ہے

میری نالوں کو سُن کر ساری دنیا کانپ اٹھتی ہے
جو دل سے آہ آتی ہے وہ عالمگیر ہوتی ہے

میرے لیل و نہار زندگی فرقت میں کٹتے ہیں
جو میرا خواب ہوتا ہے وہی تعبیر ہوتی ہے

عبث ہے کاتب تقدیرہ سے شکوہ تیرا رونق
جہاں عشق میں اُن کی نگہ تقدیر ہوتی ہے

۹

روز نامہ ''وتستا'' کے علاوہ ان کی نظمیں غزلیں، نثری نظمیں، مذہبی گیت یا پھر سیاسی ترانے مختلف اخبارات، رسائل وجرائد میں چھپ چکے تھے جس میں ''وتستا'' ''رنبیر'' ''میلاپ'' ''کرم ویر'' ''مارتنڈ'' ''شاہکار'' ''شاہراہ'' وغیرہ کی خصوصی اشاعتوں جس میں عید، ہولی، اور دوسرے مذہبی تہوار پر شائع ہوتی تھی۔ وہ شعر کے فارم میں اپنے جذبات کا

اظہار کرتے تھے ان کی نظموں میں زیادہ تر مذہبی رنگ نظر آتا ہے وہ شری کرشن جی کی یادِ فرقت میں لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔ رام نام کی مالا جپتے اور شکتی کی پوجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکی ایک نظم ''شری کرشن کی یادِ فرقت میں'' ہے۔ [۱۰]

گھائل ہے دل جگر میں فرقت سے زخم کاری
رہتی ہے دن کو وحشت شب وقف اشکباری

بے لطف ہورہی ہے یہ کائنات ساری
ہجراں نصیب دل کی آدیکھ آشکباری

بے تاب کررہی ہے اب تیری یاد ہم کو
اپنے کرم سے کردے اے شام شاد ہم کو



وہ کالی کالی زلفیں وہ رنگ سانولا سا
وہ موہنی سی مورت وہ روپ دل رُبا سا
بنسی لیے وہ پھرنا ہر رنگ میں نرالا
بچوں کے ساتھ بچہ گوکل کا وہ گوالا

حیران ہے مصور وہ رنگ ہے تمھارا
کھینچے وہ کس کی صورت وہ ڈھنگ ہے تمھارا



گوپی گوال کرتے ہیں انتظار سارے
بے تاب ہو رہے ہیں اور بے قرار سارے
دور فلک سے نالاں ہیں اشکبار سارے
ترے کرم کے جو پا امید وار سارے

صبر و شکیب کا ہے لبریز جام اپنا
فرقت میں ہو چکا ہے قصّہ تمام اپنا

گوکل میں دورا کا میں بنسی کی ہو نہیں ہے
گو پھول بھی وہی ہیں پر رنگ و بو نہیں ہے
سب کچھ وہی ہے موہن پر ایک تو نہیں ہے

اک آدھ سانس پھر تو بنسی میں آ کے بھر دے
اُٹھے وہ ہوک سب کا جو انقلاب کر دے
ویدک دھرم کا جھنڈا بھارت میں چڑھا دے

اُلفت کا راگ آ کر دنیا کو پھر سنا دے
آزاد ہو وطن پہ درود لحن مٹا دے

جب درد دے دیا تو دل صبر آزما دے

بھارت میں دھوم تیری اب کو بہ کو مچی ہے

ہے انتظار تیرا بزم طرب رچی ہے

مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی یہ نظم زبان و بیان کے اعتبار سے خاص دلکشی کی حامل ہے۔ اندز والہانہ ہے اور اردو شاعری میں ایک نئے انداز کو متعارف کرواتی ہے۔

رونق کاشمیری کے تخلص سے چھپی یہ نظم شری کرشن کے تیئں عقیدت کے جذبات کا اظہار ہے اور یہ اخبار کے مدیر کی فرمائش پر کہی گئی نظم ہے۔ اس نظم میں وہ شری کرشن جی کے تیئں شردھا یعنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور بعد کے شعروں میں وہ بھارت کو غلامی کی زنجیروں سے پاک کرنے کی تمنا دہراتے ہیں ان کو بھارت کی آزادی کا بڑا شوق تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ بھارت میں سناتن دھرم کا بول بالا ہو۔

پردیسی نے شاعری کے میدان میں ہمیشہ رونق تخلص ہی استعمال کیا ہے۔ کرتے رہے روزنامہ مارتنڈ میں چھپی ان کی یہ نظم جس میں وہ دیوی پاروتی کا گن گان کرتے ہیں اس نظم کا عنوان ''جئے ہو ماں'' میں اس طرح لکھتے ہیں۔!!

جے ہو ماں

پھولوں کا مردنگ بجاتی

اپنے آپ کو خوب سجا کر

آئی ہے رات نرالی

آؤ میرے ہمسائے آؤ

آؤ میرے سب ساتھی آؤ

آؤ اس سے کہہ دیں آج

ہم تکتے تھے تیری راہیں

جنم جنم کی آس کو لے کر

ہم بیٹھتے تھے تیرے دَوار

آؤ آج بتا دیں اسکو

اپنے من کی چھپی بات

تم نے کیا اے پیاری ماں

آوازیں سن لیں ساری

سُن کر ان آوازوں کو کیا

تم آئی ہو آج کی رات

آس دلانے دھیرج بندھانے

تم آئی ہو آج کی رات؟

اس نظم میں ماتا پاروتی کے گن گائے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ماں کے تئیں پیار اور اعتماد کو دکھایا گیا ہے۔ نظم میں بھگتی رس میں ڈوبے ہوئے نغمے اُبلتے ہیں، کبھی شری کرشن کے تئیں اپنی عقیدت کے پھول نچھاور ہوتے ہیں، کبھی رام نام کی مالا جپی جاتی ہیں، کبھی شو کے تانڈو رقص کو شعری جامہ پہنایا جاتا ہے، اور کبھی شکتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ منا کا رقص کے عنوان سے شیو کا رقص کرتے ہوئے پسِ منظر کو پیش کیا گیا ہے[12]

میں ہوں منا کا دیوتا

سمہار کا راجہ!

آ گیا ہوں رقص کرنے کے لیے کیلاش کی چوٹی پر

پی کر بہت سی بھنگ اڑا کر خاک سُلفے کی

ہلاہل کا نشہ ہے میری آنکھوں میں

سوم رس کی مستی ہے میرے روم روم میں

میں ہوں فنا کا دیوتا

سمہار کا راجہ ہوں میں

پہاڑوں چھپے ہوئے زلزلوں..........نکلو

ملا دو ایک انت کو دوسرے انت کے ساتھ

اے سوئے طوفانوں اٹھو!

پھاڑ دو ساگر کے سینے کو

بنا دو آج سب کو ایک سماں

غرق کر دو اپنی گہراؤیں میں سب کچھ

اور تم..........کارے کارے میگھ۔۔۔گرجو

زور سے گرجو

ہلا دو ساری دھرتی کو اپنی گرج سے

بہا دو پانی کے ساگر آکاش سے

پردہ نشین بجلیوں۔۔۔پھاڑ دو نقاب کو

کوندو کسی کے بنائے ہوئے سنسار پر

جلادو سب کچھ اپنی آگ میں

اُٹھو۔۔۔اٹھو میرے سب

میں کر رہا ہوں رقص منا کا۔۔۔

میں گا رہا ہوں گیت منا کا۔۔۔۔

''مانا کا رس''

شیو کا رقص، شیو کے قہر وغضب کا علامتی رنگ ہے۔اس میں شاعرانہ نازک خیالی نہیں بلکہ جوش وخروش، لب ولہجہ کی گھن گرج اور جلال کا اظہار کیا گیا ہے۔

دوسری طرف یہ رنگ بھی ملاحظہ کیجئے۔ رادھا کے روپ میں وارفتہ جذبات کا اظہار کیسے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔نثر ہوتے ہوئے بھی اس میں شعریت کا جو آہنگ ہے وہ لایق توجہ ہے۔ [۱۳]

مان جاؤ۔۔۔

مان جاؤ۔۔۔

رادھا کے جیون

رادھا کا پریم پاگل ہو اُٹھا ہے

اسے چڑھانے کا پریم پاگل ہو اٹھا ہے

اسے چڑھانے دو یہ بار

اپنے پریتم کے پس پر

ماں جاؤ۔ ماں جاؤ۔ رادھا کے جیون

پھر نہیں آئیں گے ایسے بھلے سمکے !

نہیں آیا کرتے یہ بار بار!

جب نینوں سے باتیں کی جائیں

پریت کی بھولی ہوئی پربت کی

سچ کہتی ہوں موہن!

پھر نہیں آئیں گے ایسے بھلے سمکے !



میں بھکارن ہوں تمھاری

مجھے بھیک دو

اپنے من لہرنے والے نینوں سے میری طرف دیکھو!

اور شہد سے بھرے ہوئے ہونٹوں سے

صرف ایک بار کہدو ''رادھے''

یہی میری بھیک ہے

یہی مجھے دے دو میرے چت چور

پریم ناتھ پردیسی نے اسی دور کے آس پاس نثری شاعری سے ملتے جلتے ادب پارے تخلیق کیے۔ ان میں سے بعض بحر اور وزن سے آزاد ہیں، بعض میں دونوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی شعری آہنگ کا لازمی خیال رکھا گیا ہے۔ پردیسی شاعری کو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن شاعری پردیسی کو نہیں چھوڑتی تھی اسی لیے وہ نادیدہ دنیاؤں کی سیر کرتے رہے۔ اگرچہ وہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غربت و افلاس اور طبقاتی نابرادری کو اپنی

کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں لیکن شاعری میں اپنی جمالیاتی حس کی آسودہ حالی کا ساماں کرتے ہیں۔[۱۴] مثلاً

کہاں چھپے ہو۔۔۔میرے چاند!

میں امن کے سر بفلک پہاڑ پر چڑھتے تھک گیا ہوں

اور اب

اب وہاں پر افق پر ایک روشنی نمودار ہونے لگی ہے

اور ہنسیوں کے بادل اس طرف دوڑے جا رہے ہیں

کیا تم اپنے ہنسیوں کے بادلوں پر چڑھ کر آ جاؤ گے؟

تو پھر

میرے چاند۔آؤ

میرے آنسو تمھارا سواگت کریں گے۔

پردیسی کی بے چین اور آزاد طبیعت شاعری کے لئے موزوں نہیں تھی۔انہوں نے خود کو شاعری کی بجائے افسانہ میں اطمینان پایا۔اس بارے میں عبدالقادر سروری کہتے ہیں:

''پردیسی نے شعر گوئی ترک کردی تھی لیکن شاعری کا ذوق ان کی طبیعت میں رچا ہوا تھا اور انہوں نے نئی نئی راہیں تلاش کرلیں۔
''جوگی'' کے عنوان سے انہوں نے نثری شاعری کا جو نمونہ پیش کیا تھا وہ ذیل میں درج ہے[۱۵]

تیاگ کر دنیا کو آیا

ایشور پریم کا روگی

جیتا تھا وہ نام پر بھو کا

دن شام سویرے

گاتا تھا وہ گیت اسی کا

اُٹھ کر منہ اندھیرے

نثری نظم کی ایک اور مثال [۱٦]:

جب تم پہاڑی پر چلے گئے ہو

تب سے ہی

شام ہونے کے بعد

کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر

تمہیں یاد کرتی ہوں۔ تمھاری پوجا کرتی ہوں

اور کبھی کبھی۔ ہاں کبھی کبھی روتی ہوں۔

اس اس پر یہ۔ کہ جب تم واپس آؤ

تو میرے آنسو پھول بن گئے ہوں

اور تمھارے پیروں کو اس سڑک پر چلنے کی تکلیف نہ ہو

پردیسی نے شعری اصناف سخن میں غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ابتدائی دور میں غزل کی دلچسپیاں انہیں بھی مسحور رکھتی لیکن ترقی پسند تحریک کے زیر اثر موضوعاتی سطح پر غزل کی بجائے نظم کو ہی ترجیح دی۔ یہاں تک کہ بچوں کے لئے بھی کئی نظمیں لکھیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"آزادی کے بعد جب قبائلی دراندازوں نے ہمارے وطن پر حملہ کیا تب کلچرل فرنٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ نیشنل ملیشاء کے ایک حصّے کے طور پر دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور باشعور نوجوانوں کی جماعت تھی۔ اس کا مقصد داخلی دفاع تھا اور اس انتشار اور افراط و تفریط کے زمانے میں اندرونی امن وسکون پیدا کرنا تھا۔ پردیسی نے سب سے پہلے اسی محاذ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بندوق کاندھے پر تھامے گلیوں اور کوچوں، سڑکوں اور بازاروں میں راتوں کو پہراہ دیا کرتے تھے ۔وطن کے ننگ وناموس کے تحفظ کے لیے عوام کے لہو گرمانے والے گیت اور نغمے تخلیق کیے۔ پردیسی نے ایک ترانہ اسی زمانے میں لکھا جو زبان زدعام بن گیا۔ اور جس نے اس دور میں راتوں کے سنّاٹوں میں بھی فضاؤں میں گھن گرج پیدا کی تھی"۔[17]

قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
لڑیں گے ہم لٹیروں اور حملہ آوروں کے ساتھ
لڑیں گے ظالموں کے ساتھ اور جابروں کے ساتھ
وطن فروشوں بے وفاؤں اورشاطروں کے ساتھ
قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
سوال اب نہیں رہا یہاں کسی کی ذات کا
یہ مسئلہ نہیں ہے ایک دو یا پانچ سات کا

سوال یہ ہے قوم کی حیات کا ممات کا
قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم

۱۸

یہ ترانہ کلچرفرنٹ کے ترجمان جس کا نام ''گائے جا کشمیر'' میں بھی کئی بار شائع ہوا تھا۔اس نظم کے بارے میں غلام نبی خیال اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۴۷ء میں کشمیر پر قبائلی حملے کے دوران کشمیری ادب کا ایک قسم Renaissance سامنے آیا جب کشمیری شاعروں نے پہلی بار اپنی پوری فنی طاقت کو کام میں لا کر وطن پرستی، دیش کی حفاظت اور کشمیریوں کی غیرت اور آزاد پسندی کے انقلابی نغمے گائیے۔اس حملے کو ناکام بنانے میں بھارت نے چونکہ کشمیریوں کو اپنی فوجی امداد بھی پیش کی تھی جس پر فخر کرتے ہوئے پردیسی نے لکھا۔

قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
لڑیں گے ہم لٹیروں اور حملہ آوروں کے ساتھ

۱۹

اس نظم کے بارے میں سروری صاحب اپنے ایک تحقیقی مضمون پریم ناتھ پردیسی اور اس کا تخلیقی ذہن میں لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں کشمیر پر قبائلیوں کی یورش کے دوران عوام کے جذبات کو ابھارنے اور ان میں کشمیر کی مدافعت کے احساس کو بیدار کرنے کے لیے پردیسی نے کچھ نظمیں لکھی تھیں جن میں ایک ترانہ ''قدم

قدم'' اس زمانے میں کافی مقبول رہا۔ جس کے باعث اس نظم کو ایک اعتبار سے تاریخی اہمیت بھی حاصل ہوگئی۔'' ٢٠

اس کے علاوہ جب کبھی پریم ناتھ پردیسی کا دل چاہتا ہے تھا تو وہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے شعر کہہ لیتے ۔ وہ اپنی نظموں میں طبقاتی اور سماجی نابرابری، بھوک اور بے روزگاری کے آلام وغیرہ موضوعات پر لکھتے رہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری پر ترقی پسندی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ انقلاب کے نعرے دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ عشق وحسن کے تڑپانے والے قصے رقم کرتے ہیں اور نہ پراسرار اور نادیدہ دنیاؤں میں سیر کرتے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد بلکتی ہوئی بھوکی روحوں کا نوحہ خواں بننے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی جذبے سے انقلاب کی چنگاری پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک بہتر سماج کا قیام عمل میں آئے۔ اس کی ایسی ہی ایک نظم ''بے کار نوجوان'' کے عنوان سے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوکر بہت ہی مقبول عام ہوگئی۔ اس نظم کو لالہ ملک راج صراف نے بھی نقوشِ رنبیر میں شامل کیا۔ نظم اس طرح ہے۔ ٢٠

بے کار نوجوان

پیکر و درد و مصیبت ہے یا ہے تصویرِ غم
یا شرح حصے میں آئی ہے کوئی جاگیرِ غم

گردشیں چرخِ جفا پیشہ سے ہوں بیزار ہے
بزمِ ہستی میں مالِ زیست سے لاچار

کوششیں رہ رہ کے کرتا ہے مگر مجبور ہے
تیری ہستی کس قدر رنجور ہے معزور ہے

بے نواہوں ہوگیا ہے کس خیال خام میں
کہیں کی خاطر ہوگیا ہے مبتلا آرام میں

اٹھ ذرا نامِ خدائے پستی سے نکل
ذلتِ و ادبار کی سنسان ہستی سے نکل

ٹوٹ نہ جائے کہیں غافل حبابِ زندگی
اپنی ہمت سے دکھا کچھ انقلاب زندگی

۲۲

یہ نظم اس دور کی ہے جب پریم ناتھ پردیسی کلچرل کانگریس کے ساتھ وابستہ تھے۔ اس بات کو ذہن نشیں کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی میں شعر کہتے رہے اگرچہ پردیسی کا کوئی بھی مجموعہ کلام ان کی بے وقت موت کی وجہ سے منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن اس کے باوجود ان کا بہت سارا کلام پرانے ملکی وغیر ملکی رسائل میں آج بھی موجود ہے اور اچھی خاصی تعداد میں موجود ہے۔ اور جب بھی کشمیر میں اردو شاعری کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو پریم ناتھ پردیسی کے شعری سرمایہ کا تذکرہ بھی احترام کے ساتھ کیا جائے گا۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱: پردیسی: چند یادیں، کچھ محبتیں۔ از قیصر قلندر، ماہنامہ ''آجکل''، ص ۱۹

۲: اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص 12

۳: ہمارا ادب، ۱۹۶۹، کلچرل اکیڈیمی، ص ۸

۴: ماہنامہ ''فسانہ'' الٰہ آباد، ص ۸

۵: ماہنامہ ''فسانہ'' الٰہ آباد، ص ۱۶

۶: ہمارا ادب، ۱۹۶۹، کلچرل اکیڈیمی، ص ۱۱

۷: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار، از برج پریمی، ۱۰۶

۸: ماہنامہ ''فسانہ'' الٰہ آباد، صدیقہ بیگم کے نام ایک خط، ص ۸۔۷

۹: روزنامہ ''وتستا''، سری نگر، سنڈے ایڈیشن، ۱۵ر فروری ۱۹۳۳

۱۰: ہفتہ روزہ ''زنبیر'' جموں، کرشن نمبر، ۲ر جولائی ۱۹۳۶

۱۱: روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، شیوراتری نمبر، ۲۸ر فروری ۱۹۳۸، ص ۱۲

۱۲: روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، شیوراتری نمبر، ۲۸ر فروری ۱۹۳۸، ص ۱۶

۱۳: ''رادھا کا ہار'' ہفتہ روزہ ''زنبیر'' جموں، کرشن نمبر، ۲۳ر اگست ۱۹۳۷

۱۴: کرم ویر، لاہور، مارچ ۱۹۳۴، ص ۴

۱۵: ہمارا ادب، محمد یوسف ٹینگ، ۱۹۶۷، ص ۱۶۔۱۵

۱۶: ''پھول نشتری''، نظم، روزنامہ ''شاہکار'' دسمبر، ۱۹۳۵، لاہور، ص ۴

۱۷: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار، از برج پریمی، ۱۱۹۔۱۱۸

۱۸: کشمیر میں اردو (جلد دوم)......سروری، ص ۴۳۳

۱۹: خیالات......غلام نبی خیال، ص ۱۳۶

۲۰: ہمارا ادب، محمد یوسف ٹینگ، ۱۹۶۹، ص ۱۱

۲۱: نقوش، رنبیر، لالہ ملک راج صراف، ص ۱۴

۲۲: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار، از برج پریمی، ص ۲۲۲



پردیسی بحیثیت ڈراما نویس

پردیسی کے ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے پہلے کشمیر میں ڈراما نویسی کی صنف پر مختصر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ریاست میں اردو ڈراما ایک قدیم صنف ہے، کچھ محققین اس صنف کو ویدک عہد سے ملاتے ہیں اور بعض اس کے ڈانڈے سنسکرت ڈراموں سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اومکار ناتھ کول اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''ڈراما کسی داستانی قصے کو علمی طور پر پیش کرنے کا فن ہے اور قصّے کی تشکیل ڈرامے کو دلچسپ یا غیر دلچسپ بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے'' [1]

ارسطو ڈراما کو نقل قرار دیتے ہیں۔ ڈراما دو طرح کے ہوتے ہیں جن کو ٹریجڈی یعنی المیہ اور کامیڈی یعنی طربیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ڈراما کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار کرداروں کی حرکات وسکنات پر ہوتا ہے۔ کشمیر میں ڈراما نویسی کی ابتدا ''بھانڈ پتھر'' سے ہوئی ہے۔ ''بھانڈ'' دراصل میں ایک قوم ہے جو لوگوں کو سماج میں پنپ رہے جرائم کی نقاب کشائی دلنشین انداز میں ڈراما کے ذریعہ انجام دیتے ہیں۔ چونکہ قدیم زمانے میں لوگوں کے پاس تفریحات کے لئے کوئی میڈیم نہیں تھا اسی لئے عوامی سطح پر ڈراما کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اور اگر محققین کی مانیں تو کشمیر میں ڈراما نویسی کی تاریخ بہت ہی پرانی ہے بقول عبدالقادر

سرورؔی:

''ڈراما کی طرف ادیبوں کی توجہ کہیں منعطف نہیں رہی تاہم ریڈیو سے مختصر ڈراموں کو نشر کرنے کی ضرورت کے پیش نظر کئی ریڈیو ڈرامے اس زمانے میں وجود میں آئے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ڈراما کی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتے۔'' ۲؎

کشمیر میں ڈراما کی تاریخ کے بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''ڈرامہ نویسی میں محمد عمر، نورالٰہی کی کتاب ''ناٹک ساگر'' ڈرامائی ادب میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ایک طویل خاموشی کے بعد چند اچھے ریڈیائی اور اسٹیج ڈرامے لکھے گئے اور ان لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسیؔ، علی محمد لون، سومناتھ زتشیؔ قابلِ ذکر ہیں۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں فکشن یعنی ناول اور افسانہ میں بھی اہم اور قابل قدر کام ہوا۔'' ۳؎

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور میں ریاست سے باہر مذہبی اور تہذیبی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پروگرام اسٹیج کیے جاتے تھے جن کو مختلف ناٹک کمپنیاں انجام دیتی تھیں اور انہی دنوں پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے ریاست میں اپنا کام شروع کیا۔ یہ کمپنیاں ریاست میں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے بھی پیش کرتے تھے۔ جموں وکشمیر کی ڈرامانویسی میں ریڈیو ڈراموں کا ایک خاص مقام حاصل ہے اس بارے میں قیصر قلندر لکھتے ہیں:

''۱۹۴۸ء میں ریڈیو کشمیر کا سرینگر اسٹیشن پروگرام پیش کرنے لگا۔آل انڈیا کے تجربہ کار اہل کاروں نے یہ تجویز سامنے رکھی کہ اردو ڈرامے تو نشر ہوجائیں گے لیکن کشمیری ڈرامہ بھی ہفتے میں ایک بار نہ سہی

لیکن پندرہ واڑہ میں ایک بار پیش ہو۔'' ۴

ان دنوں ڈوگرہ دور میں کچھ ایسے سیاسی حالات پیدا ہو گئے تھے کہ لوگ خوف زدہ تھے ۔اس وقت ریاست کے ڈراما لکھنے والوں میں دینا ناتھ نادم، محمد عبداللہ شاعر، نور محمد روشن، عبدالحق برق وغیرہ نے فیچر نما ڈرامے لکھے۔اس کے علاوہ علی محمد لون، نور محمد روشن، دینا ناتھ نادم، پریم ناتھ پردیسی بھی ڈراما کی صنف میں اولین کوشش کرنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔یہاں یہ بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ پردیسی نے ''قدہ گوجواری'' لکھ کر ایک موثر سیاسی شخصیت کو پیش کیا جو باہمی رواداری اور حب الوطنی کی بین مثال ہے۔اس کے علاوہ ریاست کی ڈرامہ صنف میں اپٹا کا رول بے حد اہم تصور کیا جاتا ہے جس نے ریاست کے فنکاروں کو اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے کئی اہم مواقع فراہم کیے۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس ریاست میں کلچرل کانگریس کی بنیاد پڑتے ہی پریم ناتھ پردیسی نے بحیثیت ڈرامانویس کئی ڈرامے تخلیق کیے۔اس بارے میں قیصر قلندر لکھتے ہیں:

''سنہ سینتالیس ۱۹۴۷ء سے ایک سال ادھر کی بات ہے کہ پردیسی نے پہلا کشمیری اسٹیج ڈرامہ ''بھتہ ہر'' لکھا جو یقیناً کشمیری میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش تھی۔اسٹیج سے پہلے کچھ قسم کے ڈرامے لکھے گئے تھے یا پھر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے پیش ہوئے تھے تو پردیسی نے ایک ایسے موضوع پر قلم اُٹھایا جو عوام کی روزمرہ کی زندگی سے بہت قریب تھا۔'' ۵

ریڈیو کشمیر اور دوردرشن کے قیام سے بھی اردو ڈرامے کو کافی تقویت ملی۔اس کے علاوہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے بھی اردو ڈراموں کے فروغ میں اپنا رول ادا کیا۔اس ادارے نے اردو ڈرامے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسٹیج تیار

کروائے۔ مزید براں اکادمی کی ایماء پر کئی ڈرامے تحریر کئے گئے۔ کئی ڈرامے اگرچہ اسٹیج بھی ہوئے لیکن جموں وکشمیر کے ڈراما ادب میں ایسے ڈرامے بھی ہیں جو صرف کتابوں کی زینت بنے ہوئے ہیں جن کو ابھی تک ریڈیو، ٹی وی یا اسٹیج نہیں کیا گیا۔

پریم ناتھ پردیسی نے ڈرامانویسی کا آغاز اپنے کشمیری ڈرامہ ''بھتہ ہر'' سے کیا جو اس وقت کے ریاستی گورنر مہاراجہ کشن کول نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر اسٹیج نہیں ہونے دیا، بعد میں پتہ چلا کہ ڈراما مہاراجہ کے ظلم واستبداد کا پردہ فاش کررہا ہے۔ اس کے بارے میں قیصر قلندر لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۶ء میں کشمیر میں ایسا اقتصادی اور سیاسی بحران پیدا ہوا جس نے نئی جدوجہد کی طرف اشارہ کیا۔ ادھر آزادئ ہندوستان کے منصوبے بنائے جارہے تھے اور ادھر کشمیر کی عوام غذائی قلت سے دو چار تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نئی سیاسی بیداری پیدا ہورہی تھی؛ جو ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک میں نمودار ہوئی یہی وہ زمانہ تھا جب پریم ناتھ پردیسی نے جدید کشمیری نثر کا پہلا ڈرامہ ''بھتہ ہر'' (بھات کی لڑائی) لکھا جو اسٹیج سے وابستہ چند نوجوان ''کشمیر پیپلز تھیٹر'' کے تحت پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے چونکہ سیاسی تحریک زوروں پر تھی اور پبلک جلسہ یا اجتماع پر پابندی تھی۔ گورنر کشمیر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ناطق حکم کے بغیر ایسی ''مشق'' نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے نثر کی خاص کر جدید ڈرامے کی یہ کوشش اور امکانات صرف پابندیوں کی نذر ہوگئے۔'' ۶

اس ڈرامے کے بعد پردیسی نے کشمیر کے ایک مشہور مجاہد آزادی اور سماجی کارکن

عبدالقدوس گوجواری پر لکھا۔ جس کا نام بھی مصنف نے ''قد گوجواری'' ہی رکھا۔ اس کو کشمیری ریڈیو ڈراما کی اولین کوششوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد تقسیم ہند اور جموں وکشمیر پر برصغیر کے اثرات پر ایک اور ڈراما تخلیق کیا جس سے ان حالات کی مکمل جانکاری ملتی ہے جو اس وقت رونما ہوئے ہیں جس کا نام ''معتصم کی آخری رات'' رکھا گیا۔ پردیسی نے ''دھول'' کو بھی ڈرامائی شکل میں پیش کیا، جس میں ایک انسان کی نفسیات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ انسان کی بشری کمزوریوں اور ذہنی ارتعاش کو سمجھنے کے لیے ''فرصت کے چند لمحے'' لکھ کر ڈراما کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ اس کے متعلق معروف شاعر اور نقاد قیصر قلندر لکھتے ہیں:

> ''پردیسی اور لون جو ریڈیو کے اسٹاف ممبر تھے، بڑی شعوری کوشش کی اور بعض ایسے ڈرامے لکھے جو فنی نقطہ نظر سے ریڈیو کی کسوٹی پر پورے اترتے تھے۔''[ے]

پردیسی نے بہت سے مقالات اور مضامین بھی لکھے ہیں جو صرف رسائل کی زینت بنے ہیں۔ ان مضامین کو مدون کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مضامین سیاسی بھی ہوتے تھے اور سماجی نوعیت کے بھی۔ انہوں نے ادبی شخصیات پر بھی مضامین تحریر کئے ہیں جن میں غنی کشمیری، مرزا عارف بیگ، رابندر ناتھ ٹیگور، علامہ سر محمد اقبال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱: ڈراما کی اصناف کی تدوین...... مرتبہ اومکار ناتھ کول، ص ۱۳۸

۲: کشمیر میں اردو (جلد ۳)...... سروری، ص ۲۴۹

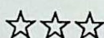
۳: ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب...... حامدی کاشمیری، ص ۲۹

۴: ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی، نومبر ۱۹۷۵، ص ۱۱

۵: ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی، نومبر ۱۹۷۵، ص ۲۶

۶: ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی، نومبر ۱۹۷۵، ص ۱۱

۷: ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی، کشمیر نمبر ص ۱۱



پردیسی بحیثیت رپورتاژ نگار

پریم ناتھ پردیسی نے ایک رپورتاژ بھی لکھا ہے جو جموں و کشمیر کی سیاسی تحریک اور تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ رپورتاژ بہت ہی نایاب ہیں لیکن خاکسار نے اس کو جی آر گڈا صاحب کی وساطت سے حاصل کیا۔ اس رپورتاژ میں پردیسی نے قبائلی حملے کے شروعاتی پانچ دنوں کو بہت ہی معاثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ یہ روداد صرف پانچ دنوں پر مشتمل ہے اسی لئے اس کا عنوان ''پانچ دن'' رکھا گیا۔ اس میں ان پانچ دنوں یعنی ۲۲/اکتوبر ۱۹۴۷ء سے لیکر ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ اس میں پردیسی نے ان حالات کی عکاسی کی ہے جب قبائلی جماعتوں نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ جس سے دونوں اطراف کے کشمیریوں نے بہت مشکلات کا سامنا کیا۔ یہ رپورتاژ ۲۲/اکتوبر ۱۹۴۷ء کے بعد پانچ دنوں کی رپورٹنگ کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔ جو پردیسی کے فکر و شعور اور قوم پرستانہ جذبے کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس رپورتاژ کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں پاکستان اور ہندوستان دونوں ممالک کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہیں۔ اگرچہ اس مین کہیں کہیں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس رپورتاژ کو راج ہنس پرکاش نے کشمیر ساہتک سبھا مشرقی پنجابی امرتسر سے مئی ۱۹۴۸ کو شائع کیا ہے اور اس کا دیباچہ اوم پرکاش نے ہی لکھا ہے وہ اس سبھا کے صدر بھی تھے وہ اس رپورتاژ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے گڈول مشن نے قومی کلچر محاذ کی طرف سے پریم ناتھ پردیسی کی لکھی پانچ دنوں کی تاریخی دستاویز دیکھی جبکہ حملہ آور سری نگر کے دروازے تک آ پہنچے تھے۔ شری پردیسی اور قومی کلچرل محاذ کے صدر پیر عبدالواحد شاہ کے ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کشمیر ساہتیک سبھا کو ''پانچ دن'' شائع کروانے کی اجازت دی''۔[1]

جب یہ رپورتاژ تحریر کیا گیا تب پردیسی قومی کلچرل محاذ کے فعال رکن تھے۔ انہوں نے یہ رپورتاژ کلچرل محاذ کے صدر پیر عبدالواحد شاہ کو دکھایا، جو خود ایک ملنسار اور حقیقت پسند انسان تھے۔ شاہ صاحب نے اس رپورتاژ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ''ایک دو باتیں'' کے عنوان سے کیا۔ جو اس طرح ہے:

''پانچ دن''

''۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء تک وہ تاریخی پانچ دن ہیں، جب کشمیر کی تاریخ بدلی اور کشمیر مجموعی طور پر نئی دنیا کے سامنے نئی حیثیت میں آیا۔ اس دنیا کے سامنے جو جمہوریت آزادی اور بھائی چارے کی دلدادہ تھی۔ ان پانچ دنوں میں آپ کو کشمیر کے عوام اور ان کی جدوجہد کی ہلکی سی جھلک نظر آئے گی وہ جھلک جس میں ودیا (علم) بھی ہے اور خود اعتمادی بھی، وطن پرستی بھی اور مضبوط اتحاد کی قابل تقلید مثال بھی ہے...... ''پانچ دن'' روداد قومی کلچرل محاذ کے مایہ ناز ممبر اور مایہ ناز ادیب پریم ناتھ پردیسی نے قلمبند فرمائی ہے۔''[2]

اس رپورتاژ کو نہ صرف ادبی حیثیت حاصل ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے اس کو بہت

اونچا مقام حاصل ہے کیونکہ اس رپورتاژ میں ہم کو ان واقعات سے واسطہ پڑتا ہے جو اس وقت کے غریب عوام کو جھیلنے پڑے ہیں، کیونکہ اس وقت ڈوگرہ سرکار نے کشمیریوں کا خون چوس لیا تھا اور دوسری طرف سے قبائلوں نے کشمیر پر دھاوا (حملہ) بول دیا۔ لیکن اس سب کے باوجود لوگوں نے اتحاد کا نعرہ بلند کیا۔ اور حملہ آوروں کے حوصلے پست کر دیئے۔ ان پانچ دنوں کو پردیسؔی نے بے حد فنکارانہ انداز سے ہو بہو پیش کیا ہے۔ اس رپورتاژ کو پڑھنے کے بعد قاری اپنے آپ کو ان حالات میں برابر شریک سمجھتا ہے اور وہی حالات انسان پر طاری ہو جاتے ہیں۔

پہلا دن:

(۲۲/اکتوبر ۱۹۴۷ء) اس دن لوگ اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے اور اس بات سے قطعی بے خبر کہ ان پر کون سا طوفان آنے والا ہے۔ چونکہ یہ موسم کشمیر میں شادیوں کا ہوتا ہے اور لوگ شادیوں میں محو تھے۔ اور باقی ماندہ لوگ اپنی زندگی کے مسائل سے نبرد آزما تھے کہ قبائلوں کے آنے کا بگل بج اُٹھا۔ معصوم کشمیریوں کو کیا پتا تھا کہ حالات دگرگوں ہو گئے ہیں۔ کشمیر پر قبائلیوں کی ناکہ بندی کا تذکرہ پریم ناتھ پردیسی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

> ”اور جہلم بہہ رہا تھا اور محکوم تھا مگر مایوس نہیں چونکہ پاکستان نے کشمیر کا سب کچھ روک لیا تھا لیکن جہلم کے پانی کو نہیں روک سکا۔ وہ نیلا پانی جو کروڑوں روپیوں کا مال اپنی چھاتی پر اٹھا کر پاکستان پہنچاتا تھا۔ اور وہاں کے سرمایہ داروں کی جیبیں بھرتا ہے...... آر پار کے مکانوں سے کہیں کہیں قاری کے گیت گونج رہے تھے اور ان سے پرے لال چنار ایسے نظر آ رہے تھے جیسے ان کے لاتعداد پتوں پر کسی نے دولھا

بنانے کے لیے مہندی ملی ہو۔''۳۳

دوسرا دن: ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۷ء۔ دوسرے دن میں ایک کشمیری پنڈت، جو آزاد کشمیر میں رہتا تھا لیکن قبائلیوں کے لوٹ مار سے گھربار چھوڑ کر سرینگر چلا آیا تھا، کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ لوگوں کو قبائلی ظلم سے باخبر کراتا ہے اور اس کے بعد سرینگر میں اس پورے معاملے میں سرگوشیاں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے دن پردیسی شیخ محمد عبداللہ (جو کہ اس وقت کے بہت بڑے سیاسی لیڈر تھے) کی جم کر تعریفیں کرتا ہے اس میں وہ شیخ عبداللہ کی ایک تقریر کو بھی من وعن نقل کرتا ہے۔ جس میں وہ قوم کو پاکستانی حملے اور عزائم سے آگاہ کرتا ہے۔

تیسرا دن:

۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء۔ تیسرے دن پورے شہر کو قبائلی حملے کی آگاہی ملتی ہے اور جس کی وجہ سے ہر طرف ہُو کا عالم پیدا ہوتا ہے، پورا شہر اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے کیونکہ قبائلی حملہ آور بجلی گھروں پر حملہ کرتے ہیں چونکہ تیسرے دن کو دسہرہ کا تہوار بھی ہوتا ہے اور پردیسی نے اپنی ادیبانہ صلاحیتوں سے دسہرہ کو ''قبائلی حملہ'' سے بہترین انداز میں جوڑ دیا ہے۔ وہ قبائلی حملہ آوروں کو ''راون'' کی فوج سے تعبیر کرتا ہے اور شیخ عبداللہ اور کشمیر ملیشیاء کو رام سینا (رام کی فوج) قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ ڈوگرہ سرکار کی بے توجہی کی بہتر عکاسی بھی کی ہے۔ ڈوگرہ حکومت نے حملہ آوروں کے سامنے کس طرح بے بسی ظاہر کی اور خود جموں بھاگ گئے اور ڈوگرہ فوج اور حکمرانوں نے کس طرح اس مصیبت کی گھڑی میں کشمیریوں کو قبائلیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ اس رپورتاژ میں پوری تفصیل ملتی ہے۔ پردیسی نے سکولر ذہنیت کی عکاسی بھی کی ہے کیونکہ اس رپورتاژ میں وہ نام نہاد ہندو لٹیروں

کی قلعی کھولتے ہیں:

''کشمیری ہندوؤں کے لیڈر جو ستی شہرت کے لیے بڑے معتبر بنے پھرتے تھے اور معمولی واقعات پر اپنے معرکہ خیز بیانات شائع کرواتے تھے، آج کہیں نظر نہیں آتے تھے اور ان کے خلاف شہر بھر میں اظہارِ ناراضگی پایا جاتا تھا''[۴]

پریم ناتھ پردیسی نے اگر چہ سخت لہجہ اپنایا ہے لیکن پھر بھی اپنی بات کو سلیس اور جاندار اسلوب میں پیش کیا ہے۔اس میں دو رائیں نہیں کہ پردیسی حق بات کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔اپنے سخت گیر لہجے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''پنجاب اور سرحد کے یہ راون، جو علم اور روشنی کے اس زمانے میں رہتے ہوئے بھی انسان نہ بن سکے، صرف جلائے جانے کے حقدار نہ تھے بلکہ صفحہ ہستی سے مٹانے کے مستحق تھے۔تاکہ انسانیت بے داغ ہو اور کشمیر کا شیر (شیخ عبداللہ) جس کے کندھے پر زمانے نے رام کا دھنش رکھا تھا، اپنی نہتی فوجوں کو جمع کر رہا تھا''[۵]

چوتھا دن:

۲۵/اکتوبر ۱۹۴۷ء۔اس دن میں پردیسی نے فرقہ پرستوں کی کوششوں کو اُجاگر کیا اور ساتھ میں اتحاد کی ضرورت کو بیان کیا۔۲۵/اکتوبر کے بے رونق صبح کو اس انداز میں پیش کیا۔

''خدا خدا کر کے صبح ہوئی وہ صبح جس کے ساتھ افق کی وہ مسکراہٹ نہ تھی جس کی جلوہ میں نہ تاروں کے قہقہے تھے اور نہ فرشتوں کا نور جو تاریک اور پُرخوف اوپر سے اُچھل کروادی میں

کود پڑی تھی جس کے مہیب جبڑے کھلتے تھے اور لمبے ہاتھ لرزہ خیز یہ انتہائی خوف کی صبح تھی پر قیامت کی صبح تھی یہ ۲۵ اکتوبر کی تاریخی اور ناقابلِ فراموش صبح تھی''۔ ۶

یہی وہ دن تھا جب لوگوں نے مہاراجہ کے بھاگنے کی خبر سنی لیکن اس پیچ پیس برگیڈ کے رضا کار، جس میں وکیل، ڈاکٹر، ادیب، مصور ملازم اور عام لوگ شامل تھے۔لوگوں کی بلا امتیاز مدد کرنے تھے اور ساتھ میں ان کیمپوں میں رسد رسائی کا کام بھی کرتے تھے جو حملہ آوروں کے ڈر سے بھاگ کر پناہ گزیں کیمپوں میں رہ رہے تھے اور سب سے بڑھ کر جو کام پیس برگیڈ نے کیا وہ تھا ریاست کے لوگوں میں اتحاد کا نعرہ۔

پردیسی نے شیخ عبداللہ کو روسی انقلاب کے نقیب ولادمیر لینن کا درجہ دیا، جو اتحاد کو ہتھیار کا درجہ دیتے تھے۔ جس سے قبائیلیوں کو اپنے منصوبوں میں ناکام کیا جاسکتا ہے۔اسی آخری تقریر کے بعد شیخ محمد عبداللہ دلی روانہ ہوتے ہیں اور وہاں پر ہندوستان کے وزیر اعظم کے ساتھ عارضی الحاق کا معاہدہ کرتے ہیں۔

پانچواں اور آخری دن: ۲۶ را کتوبر ۱۹۴۷ء۔ اس دن میں پردیسی نے لوگوں کی چہل پہل اور شیخ صاحب کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں۔اس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں کے جوش کو بھی سراہا ہے۔ آخر میں پردیسی لکھتے ہیں۔

> ''وین مجسٹک ہوٹل کے نزدیک چوراہے پر کھڑی ہوگئی اور اس کا لاؤڈ اسپیکر مولانا عبدالسلام ہمدانی سے گونجنے لگے جو زور، زور سے کہہ رہے تھے کہ کل صبح ہندوستانی فوج سرینگر پہنچنے والی ہے اور کشمیر ہندوستان میں شامل ہوگا۔''۷

اس کے بعد ۲۷ را کتوبر ۱۹۴۷ء کو پہلی بار ہندوستانی فوج نے کشمیر کی سرزمین پر اپنا قدم رکھا۔

پریم ناتھ پردیسی کا یہ رپورتاژ اپنی نوعیت کا ایک منفرد رپورتاژ ہے جو قبائلی حملے کے علاوہ مختلف قسم کے لوگوں کی ذہنیت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ پردیسی نے کشمیر کے ان پانچ دنوں میں مفلس لوگوں کی انتہائی فنکارانہ اور ادیبانہ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پردیسی کا دل کشمیریوں کے درد سے پُر تھا کیونکہ اسی درد نے پردیسی کو یہ سب لکھنے کی ترغیب دی ہے۔ یہ رپورتاژ کشمیر کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔



حوالہ جات:

۱: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۲

۲: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۱۵

۳: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۲۰

۴: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۳۰

۵: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۳۴۔۳۲

۶: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۳۸۔۳۷

۷: رپورتاژ ...... پریم ناتھ پردیسی، ص:۴۰



پریم ناتھ پردیسی
مشاہیر کی نظر میں

سید احتشام حسین:

پردیسیؔ کا شعور اس کشمیر میں جوان ہوا جو قومی آزادی کی جد جہد میں مصروف تھا اور عوامی بیداری نے گردو پیش کے ماحول پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس ماحول کو فطرت نے حسین و جمیل بنایا تھا۔ لیکن انسان اس کو گھناؤنا بنا رہا تھا۔ کشمیر کے متعلق جو شخص بھی کچھ لکھے گا، اس کا اس زبردست کشمش کو محسوس کرنا لازمی ہے ورنہ وہ کشمیر کی روح میں نہیں اتر سکے گا۔ پردیسی کے افسانوں میں اس کشمش کا شعور نظر آتا ہے جسے فلسفیانہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں فکر انگیز عناصر ضرور ملتے ہیں۔ پردیسی کو کشمیر کی زندگی، تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ یہی ایک افسانہ نگار اور انسان کی حیثیت سے ان کی بڑائی ہے۔

پریم ناتھ درؔ:

پردیسیؔ نے اپنی ایک ایک سانس کو اپنے وطن کی خدمت میں جوت دیا۔ جس نے اپنی تیز نظر سے اپنی ذات کو نہ اپنے مفاد کو دیکھا۔ گردو پیش کی حقیقت کھوجی، گہرائیاں ناپیں اور بیان کے جادو سے ہر کس و ناکس کو، ہر ذوق والے یا بد ذوق کو اسے جو سننے کے لیے تیار تھا۔ اور اسے بھی جو نہیں تھا۔ اپنے ساتھ کھڑا کیا۔ اسے سننے کے لیے مجبور کیا اور سناتے سناتے اسے سلایا نہیں، اس کی چٹکیاں لیں اور اس سے جگایا۔ وہیں پردیسیؔ جو کشمیر میں ایک نئی آندھی اڑاتا ہوا آیا تھا۔ آناً فاناً جیسے ایک آندھی ہی میں چلا بھی گیا۔

سہیل عظیم آبادی:

افسانہ نگار کی حیثیت سے پردیسی اردو ادب میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے افسانوں میں بلا کا اثر ہوتا تھا۔ اس اثر کی تنہا وجہ کشمیر اور کشمیریوں سے ان کی بے پناہ محبت تھی۔ وہ کشمیریوں کے دکھ درد اور ان کی زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بڑے فن کارانہ انداز میں بیان کرتے تھے۔ جس کا اثر پڑھنے والوں کے دل میں بہت دیرپا ہوتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ پردیسی کے افسانے پڑھنے کے بعد کوئی شخص خود کو کشمیر اور کشمیریوں سے قریب محسوس نہ کریں۔

پردیسی کی زندگی کشمیر کے لیے تھی۔ ان کا فن کشمیر کے لیے تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ان کے افسانوں کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کا شاہد ہے۔

غلام محمد صادق:

پردیسی ہماری ریاست کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ وہ کبھی حقائق سے منہ نہیں موڑتے تھے۔ جب ہماری قومی تحریک کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عوام پر شخصی نظام کے مظالم کا شکنجہ بھی زیادہ زور سے کیا گیا۔ تو پردیسی خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے "جواری"، "کتبے"، "ان کوٹ"، "کاغذ کی جھنڈی" وغیرہ کہانیاں لکھ کر نہ صرف کشمیر میں بلکہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں بھی شہرت حاصل کی۔ ان کہانیوں میں ان کے شعور کے ارتقاء کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ان کے کردار ہمارے حقیقی کردار ہیں۔ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے دوران میں انہوں نے کشمیری زبان میں ایک ڈرامہ "بھتہ ہر" کے نام سے لکھا۔ جس میں بھوکے عوام کی دل دوز تصویر پیش کر کے شخصی نظام کو للکارا، جو عوام کے غذائی مسئلے کو حل نہ کر سکا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی:

پردیسی نے یہ کہانیاں بہت سوچ بچار کے عالم میں لکھی ہیں لیکن ان کہانیوں کی پرسکون سطح کے نیچے ہم ایک ایسا دل دیکھتے ہیں جو انسانیت کے دکھ سے تار تار ہے۔ اس کی ہموار آواز کبھی کبھی تقدیر کی آواز کی طرح فیصلہ کن نظر آتی ہے۔ پردیسی کسی مہدی کے آنے کی اور بالا آخر انسان کی نجات کی امید نہیں دلاتا۔ موجودہ دور کے حساس نوجوانوں کی طبعی قنوطیت اس کے دل اور وجود کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ اپنا ایمان کھو چکے ہیں، اور کوئی چیز انہیں ابھارنے کے لیے نظر نہیں آتی۔ مذہب چند رسوم وروایات کا ایک مرقع بن کر رہ گیا ہے اور کسی قسم کا معاشی رد و بدل بے معنی ہے۔ دنیا کے کسی عقیدے میں تسلی نہیں بغیر اس کے کہ انسان اپنی مکمل شکست کو تسلیم کرے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے، وہ سب کے لیے غم کھاتا ہے۔ پردیسی کی کہانیوں کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ یہ کہانیاں ہمیں زندگی کے گوناگوں مصائب کو برداشت کرنا سکھاتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق

مجھے پنڈت پریم ناتھ صاحب پردیسی نے اپنی چند کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ جنہیں پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انہیں چھوٹے افسانے لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے، ان میں تخیل بھی ہے اور مشاہدے کی قوت بھی۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ افسانوں میں مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ پریم ناتھ صاحب کو اپنے ملک کے غریبوں سے بہت ہمدردی ہے اور انہوں نے بعض کہانیوں میں ان کی تکلیفوں اور ان کے دردِ دل کی کیفیت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ انہیں اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت ہے اور ان کی زبان سادہ اور دل پذیر ہے۔

خواجہ غلام سیدین:

میں نے بہت دلچسپی سے پریم ناتھ صاحب پردیسی کے افسانوں کو پڑھا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے یہ افسانے بہت قابلیت اور خوش مذاقی کے ساتھ لکھے ہیں۔

پروفیسر نند لال کول طالبؔ:

پنڈت پریم ناتھ صاحب ہمارے ملک کے ان خوش مذاق اور ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں نہ صرف افسانہ نویسی کا شوق ہے بلکہ جو اپنی قابل قدر تحریروں سے ایک عرصے سے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ''شام وسحر'' ان کے افسانوں کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنے خاص انداز میں اپنے ہم وطنوں کے اصلی حالات کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔

پنڈت زندہ کول ''ماسٹر جی''

کشمیر اور بیرون کشمیر کے بعض اخباروں میں پردیسی کی لکھی ہوئی مختصر کہانیاں کبھی کبھی میری نظر سے گزرتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کا مصنف ضرور کوئی اعلیٰ درجہ کا صاحبِ فن ہوگا کیونکہ جب کبھی میں چار پانچ سطریں ذرا یونہی پڑھ لیتا۔ ساری کہانی پڑھے بغیر رہا نہ جاتا تھا۔ اور یہ قابل افسانہ نگاروں کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیات ہے۔

منشی محمد دین فوق:

میں پنڈت پریم ناتھ صاحب پردیسی کی ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو جو اس سے قبل مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں، بڑے شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ ان میں ملک کی سوشل اصلاح کی جھلک بھی ہے۔ غریبوں کے دُکھڑے بھی دردِ دل سے بیان کیے گئے ہیں اور اس زبان میں جو سادہ سلیس اور نہایت میٹھی ہے۔ یہ اصلاحی اور اختلافی

افسانے ان کی صحیح حب وطن کا مظہر ہیں۔ان کی نثر پر شاعری قربان ہے۔ان کی تحریروں کا ادبی رنگ ان کے ادیب کامل ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔وہ اپنی نتیجہ خیز کہانیوں کی بدولت کشمیر کے ''منشی پریم چند'' معلوم ہوتے ہیں۔

نور شاہ:

پردیسی کے افسانوں کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانے تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بھی مشہور و معروف اور معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے اور پسند بھی کیے گئے۔ان جرائد میں لاہور سے شائع ہونے والے جریدے ''ہمایوں'' اور ''ادب لطیف'' بھی شامل ہیں۔انکی کہانی ''ٹیکہ بٹنی'' اپنے دور کی ایک عظیم کہانی تھی۔پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی صحیح عکاسی کی ہے۔اور کشمیر کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں میں اس زمانے کے کشمیر کی حقیقی سندرتا نظر آتی ہے۔اور بدصورتیاں بھی، جن سے کشمیر اور کشمیریوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔



پریم ناتھ پردیسی

کے

منتخب افسانے

اگلے سال

ابراہیم، منشی بدرالدین کی عزّت بلا وجہ نہ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منشی بدرالدین وہ شخص ہے جو گذشتہ پندرہ برس سے اس کا مستقل خریدار ہی نہیں بلکہ جانا پہچانا بیوپاری ہے۔ یوں تو منڈی میں حاجی بدرالدین کی ٹکر کے سینکڑوں بیوپاری تھے۔ لیکن سب کے دل کھوٹ سے بھرے ہوئے۔ وہ مال خریدنا تو جانتے تھے' لیکن دل خریدنا نہیں جانتے تھے' ایک سال کسی سے سودا کیا' دوسرے سال اس سے آنکھیں پھیر کر کسی دوسرے کو پُھسلایا جہاں پیسے کے نفع کی امید ہو۔

لیکن حاجی بدرالدین میں یہ عیب نہ تھا۔ وہ ایک ہی نظر سے آدمی کی انتڑیاں گن لیتا تھا۔ اپنے کام میں پورا ماہر اور ہوشیار تھا۔ لیکن جہاں کسی کی خصلت میں آشتی' صلح وصفائی یا سادگی کی تھوڑی بہت تری دیکھتا تھا۔ وہیں کا ہو جاتا تھا۔ نہ مال پرکھتا نہ ناپ تول لیتا۔ صرف زبان پر اعتبار اور اکتفا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا ہر سودا منفعت بخش ہوتا تھا۔ ''وڈ'' لینے والا زمیندار بھی راضی اور خود ''وڈ'' دینے والا بھی۔ اسی سبب سے اُس کے زمیندار اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ جو کچھ ان کے کھیتوں سے نکلتا تھا اس کے آگے رکھتے تھے۔ فصل پھولوں ہی میں ہوتی تھی اور منشی بدرالدین اپنے کسانوں کے ہاں یا تو خود آنا جانا شروع کرتا تھا یا اپنے کارندے بھیجتا تھا۔ اس سے قیمتیں طے ہوتی تھیں۔ سودے ہوتے

تھے۔شادی بیاہ کے موقعے پر بھی جب کسان ہر طرف سے نا امید ہوتے تو ان کی حاجت روائی بدرالدین کے سوا دوسرا نہ کرتا تھا۔بعض اوقات ایسے موقعوں پر وہ اگلے دو برس کی فصلوں تک کا سودا کر لیتا تھا۔حاجت مند زمین دار کو اس وقت بدرالدین فرشتے سے کم نہ دکھائی دیتا تھا۔اس کے نزدیک شاید فرشتے کی یہی پہچان تھی جو وقت پر حاجت روائی کرے اور ہونے والی فصلوں کی ''وڈ'' خُدا کے توکل پر دے آئے۔

ابراہیمؑ کو وہ دن یاد تھا جب بدرالدین دیسی لٹھے کا کُرتہ اور سر پر پانچ آنے والی ٹوپی پہنے اس کے پاس آیا۔ابراہیمؑ اپنی بیوی اور بچوں سمیت کھیت سے آلو نکال رہا تھا۔بدرالدین کھیت کے کنارے پر کھڑا ہو گیا اور حرص بھری نگاہوں سے آلوؤں کو دیکھنے لگا۔اس سال فصل بھی خُدا کے فضل سے اچھی تھی۔ابراہیم مسرت کی پینگوں میں جھول رہا تھا۔ایک نوجوان سفید پوش کو کھیت کے کنارے کھڑا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔بیٹے سے بولا۔''سیر بھر آلو اسے بھی دے دو۔جانے کس خانقاہ کا دربان ہے''

اس کی بیوی نے ٹوک کر کہا۔''کیا ساری فصل اب ان درویشوں ہی کی نذر کر دو گے؟''

ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔سوالی ہمیشہ خُدا کی طرف سے آتا ہے۔اسے بھرے کھیت سے نا امید لوٹا دینا اچھا نہیں۔''

بیوی نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے آلوؤں کی ٹوکری لیتے ہوئے خاوند سے کہا ''گھر بار تو نہیں لٹانا ہے جن کے پاس دولت ہے وہ کسی پر تھوکتے بھی نہیں، رہنے دو یہ فیاضیاں!''

ابراہیم نے گرج کر کہا۔کیا کرتی ہو؟ اگر زمیندار ہی کی نظر پست اور ظرف تنگ ہو تو دُنیا میں خیراتیں کون کرے؟ خُدا دولت اس لئے نہیں دیتا کہ اس کے بندوں پر دروازہ

بند کر دیا جائے۔

بدرالدین اب کھیت کے کنارے کھڑا میاں بیوی کی بحث سن رہا تھا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے ان کے نزدیک آ گیا۔ اور بولا...... ''تم نے مجھے بھی سوالی ہی سمجھ لیا۔ اس لئے کہ میرے بدن پر نفیس کپڑے نہیں''

ابراہیم نے مسکرا کر بے پروائی سے کہا۔ ''بابا فصل کاٹنے کے موقع پر جو بھی میرے کھیت میں آیا' سوالی ہی تھا۔ شہنشاہ نہ تھا۔ تم ناراض کیوں ہو گئے' یہ قسمت کا کھیل ہے۔''

بدرالدین کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے کہا۔ ''دراصل کسان بے وقوف ہوتا ہے......''

ابراہیم نے دوبارہ مسکرا کر کہا۔ ''ہے بے وقوف نہ ہوتا تو شہر میں بڑی بڑی توندیں نکالے' بیوپاری نہ ہوتے۔ یہ ہم لوگ ہی بے وقوف ہیں جو اپنی بستی اجاڑ کر اوروں کی بستیاں آباد کرتے ہیں۔ سچ ہے بابا' کسان دراصل بے وقوف ہوتا ہے۔''

بدرالدین نے کہا...... ''تم لوگوں کو آدمی پہچاننے کا شعور نہیں۔ کسی کے بدن پر موٹا لباس دیکھا' جھٹ اس کی آبرو سے کھیلنے لگے۔''

ابراہیم نے درانتی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا...... ''تم میرے والد جنتی کی طرح بڑے تیز مزاج معلوم ہوتے ہو۔ سچی بات کہہ دی اور تم آپے سے باہر ہونے لگے۔''

بدرالدین نے کہا۔ ''خُدا خیر کرے' بہت اِترائے ہوئے معلوم ہوتے ہو...... آنکھوں پر اس قدر مستی چھائی ہوئی ہے کہ بیوپاری اور سوالی میں فرق ہی نہیں کر سکتے۔''

ابراہیم نے قہقہہ لگا کر پوچھا...... ''تم بھی بیوپاری ہو؟''

بدرالدین نے کہا۔ ''بیوپاری کے سر پر سینگ ہوتے ہیں کیا؟''

ابراہیم اپنا کام کئے جارہا تھا' بے پروئی سے بولا۔ سینگ نہیں ہوتے۔ اس کے پاس روپوں کی تھیلیاں ہوتی ہیں' وہ خودنہیں بولتا' تھیلیاں بولتی ہیں۔

بدرالدین ہونٹ چبانے لگا۔ ابراہیم نے اُس پر ایسی چوٹ کی تھی جس کا اسکے پاس جواب نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک آلو کو اُلٹ پُلٹ کر دیکھنے کے بعد بدرالدین نے پوچھا سودا کرو گے؟'' ابراہیم نے حیران ہوکر پوچھا۔ کیا بھاؤ لوگے؟''

اب تک ابراہیم کو یقین تھا کہ بدادین مذاق کررہا ہے۔ اسی لئے اس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

بدرالدین نے پوچھا۔ ''کتنے آلو نکلیں گے تمہارے کھیت سے؟''

ابراہیم کو اب پورا یقین ہوگیا کہ بدرالدین مخول کررہا ہے۔ اُس نے دوبارہ طنزاً کہا۔ ''کھیت تمہارے سامنے ہیں اور یہ سوال تم بیوپاری ہوکر مجھ سے پوچھ رہے ہو؟''

بدرالدین نے سرسری نگاہوں سے کھیت کا جائزہ لیا اور کہا...... ''یہ سب کھیت تمہارے ہی ہیں؟

ابراہیم نے کہا۔ ''شکر ہے مالک کا!''

بدرادین نے کہا۔ ''سو من سے زیادہ نہ نکلیں گے' جی چاہے تو ابھی سودا کرلو'

ابراہیم نے مسکرا کر کہا...... ''بڑے بیوپاری نکلے۔ تم ایسے دو چار بیوپاری اور ہوں تو کسانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔''

بدرالدین نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ ''خیر' جتنے بھی نکلیں گے' تین روپے من کے حساب سے لوں گا۔ کہو منظور ہے؟''

ابراہیم اور اس کی بیوی تین روپے من کا سودا سُن کر للچا گئے۔

اُس کی بیوی نے درانتی زمین پر رکھتے ہوئے اور زیرِ لب مُسکرا کر بدرالدین سے کہا'' آج کل آلو بارہ روپے خروار بکتے ہیں۔ آپ کیا دے رہے ہیں ہمیں!''

بدرالدین نے کہا...... ''دیدی! یہ ٹھیک ہے لیکن جب تک ہمیں بھی ٹکہ آنہ نفع نہ ہو، ہم کن کے گھر ٹکڑے توڑیں......''

ابرہیم نے کہا۔ ''کسر کھاؤں گا لیکن قیمت یک مشت لوں گا۔''

بدرالدین نے کہا۔ ''ابھی لے لو، مرضی ہو تو اگلے سال کا سودا بھی کر رکھو اور قیمت لے رکھو۔''

اگلے سال کا لفظ سن کر ابراہیم چونک پڑا۔

اس نے حیرت بھری نظروں سے بدرالدین کو دیکھ کر کہا۔ ''اگلے سال کا سودا؟''

بدرالدین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں!''

ابراہیم نے پوچھا۔ ''اگر اگلے سال فصل اچھی نہ ہوئی تو......؟''

بدرالدین نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ میری قسمت ہے، تم کو اس سے کیا غرض۔ تم اپنی قیمت لے لو۔''

اس وقت ابراہیم اور اس کی بیوی کو بدرالدین فرشتے سے زیادہ پاکیزہ دکھائی دیا جو محض اپنی قسمت کے توکل پر انہیں اگلی فصل کی قیمت دے رہا تھا۔

سودا طے ہونے کے بعد بدرالدین نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اب آدمی پہچان سکو گے؟''

ابراہیم زلرلب مسکریا اور سر جھکا دیا۔

شروع شروع میں بدالدین ایسا بدقسمت تھا کہ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، نقصان اُٹھایا۔ آخر چاروں طرف سے ناامید ہو کر اس نے آلوؤں کا بیوپار شروع کیا۔

ان دنوں آلوؤں کی بہت مانگ تھی ۔ نرخ روز بروز بڑھتے جاتے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے آلوؤں کا معمولی سوداگر دنوں میں سیٹھ بن گیا' اس کی حیثیت' امارت اور چمکتی ہوئی تجارت کو دیکھ کر بدرالدین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ منڈی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ تھوک اور پرچون دونوں طرح سے آلو بیچنے لگا۔ ابراہیم کے آلو اس نے تین روپے من کے حساب سے لئے' ہاتھوں ہاتھ وہ پانچ روپے من کے حساب سے فروخت کئے۔ ایک ہی سودے میں دو اڑھائی سو کا منافع دیکھ کر اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ شروع شروع میں نقد قیمت دے کر سودے کرتا تھا۔ جب مزا آیا تو ''وڈ'' پر بھی سودے کرنے لگا۔ کسان اس راز کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ نقد روپیے دیکھ کر ہی جھومتے تھے۔ لیکن بدرالدین کی نظروں سے کچھ اوجھل نہ تھا۔ فصل کاٹنے کے موقع پر وہ کھیتوں میں جاتا اور اپنی نگرانی میں آلو نکلواتا۔

وہ کسان جو اس کے ساتھ سودے کرتے تھے' جہاں تھے ہیں رہے لیکن بدرالدین چند سالوں ہی میں منشی بدرالدین بن گیا۔ پھر حاجی بدرالدین' پھر سیٹھ بدرالدین نکڑ کی دکان اور سے اور ہو گئی۔ ایک طرف ایرانی قالین بچھا تھا۔ اس پر ایک گاؤتکیہ رکھا گیا جس کا غلاف سبز مخمل کا تھا۔ کچھ کارندے رکھ لئے گیے۔ دن بھر حاجی بدرالدین اپنی دکان پر بیٹھے 'لاریاں سامنے کھڑی ہو جاتیں۔ وہ اپنی نگرانی میں آلو بھرواتے۔

کبھی کبھی کسان دکان پر آتے تو پاؤں صاف کر کے دور کونے میں بیٹھ جاتے جب حاجی صاحب کو موقعہ ملتا' ان سے بھی دو چار باتیں کر لیتے۔ اب نہ وہ دیسی لٹھے کا کرتہ تھا اور نہ پانچ آنے والے ٹوپی' ان کی جگہ ریشمی پیرہن ۲۶ نمبر کی ململ اور دوشالے نے لے لی تھی۔

ابراہیم کبھی کبھار دکان پر آتا۔ حیران رہ جاتا۔ اپنی اس غلطی پر جو اس نے پہلے

دن بدرالدین کو دیکھ کر کی تھی۔ اکثر نادم ہوتا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی مسرت تھی کہ بدرالدین انسان نہیں، فرشتہ ہے اور وہ خود کس قدر خوش نصیب جس کا کاروبار ایسے نیک خصلت انسان سے ہو۔

پندرہ برس بیت چکے تھے۔ آلوؤں کی قیمت اس سال خلاف توقع بڑھ گئی تھی۔ بدرالدین کا کارندہ سودا کرنے کے لئے ابراہیم کے ہاں آگیا۔ چائے وغیرہ پی کر ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔ ''اس سال آپ کو ''وڈ'' میں اضافہ پڑے گا، منشی جی!''

کارندے نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''کیوں بھلا؟''

ابراہیم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ نہیں جانتے؟ کتنے بھولے بنتے ہیں۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''پھر بھی!''

ابراہیم نے کہا۔ ''آلوؤں کی قیمت جو چڑھ گئی ہے''

کارندہ نے زور سے ہنسا اور کہا۔ ''خوب! جب قیمت گھٹ گئی تھی، اس وقت بھی کچھ کہا تھا؟''

ابراہیم نے چلم پر آگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''خُدا کی قسم آج تک ایسا سودا ہمارے ساتھ نہیں ہوا جس میں نرخ بازار سے آپ نے ہمیں زیادہ دیا ہو''

کاندے نے پوچھا۔ ''پھر سودا نہ کرو گے''

ابرہیم نے جلد جلد کہا۔ ''انشاء اللہ کروں گا۔ لیکن ظلم نہ ہو، حاجی صاحب میرا پندرہ برس کا جانا پہچانا بیوپاری ہے۔''

کارندے نے پوچھا۔ کس بھاؤ پر دو گے اس سال؟

ابراہیم نے کہا۔ ''حضرت اس سال آلو سولہ روپے خروار بکتے ہیں۔ آگے آپ

مالک ہیں، جو چاہیں دے دیں۔''

کارندے نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے، منڈی کی ہوا لگ گئی ہے، جبھی قیمتیں یاد رکھی ہیں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''خدا کی قسم! یہ بات نہیں۔''

کارندہ سنجیدگی سے مسکرایا اور کہا۔ بے وقوف! حاجی جیسا بیوپاری خواب میں بھی نہ ملے گا۔ جو فصل بونے سے پیشتر ہی تمہاری باتوں پر اعتبار کرتے ہیں اور تھیلیاں تمہارے حوالے کرتے ہیں۔ پھر بھی تم احسان فراموش بنتے ہو۔

ابراہیم نے کہا۔ ''لاحول ولاقوۃ! ہم ان کا نمک پندرہ سالوں سے کھا رہے ہیں کس منہ سے ان کی ناشکر گزاری کریں''۔

کارندے نے پچاس روپے کے نوٹ اس کے سامنے رکھے اور کہا۔ ''یہ ہونے والی فصل پر پیشگی ہے۔ ہوسکا تو میں بھی حاجی صاحب سے اس سال قیمتوں میں دو چار آنوں کا اضافہ کرنے کے لئے کہوں گا۔ لیکن اس پر زیادہ بھروسہ نہ رکھنا، سمجھے!''

کارندے نے مسکرا کر کہا۔ ''آج نئے بھاؤ مقرر کرنے ہیں۔ نادان جو بھاؤ پچھلے سال تھے وہی ملیں گے۔ ہاں حاجی صاحب کچھ اضافہ کریں تو الگ بات ہے۔''

ابراہیم نے بے دلی سے کہا۔ ''نہیں منشی صاحب! یہ ظلم ہے، میں چھ روپے میں خروار نہیں دے سکتا۔ اتنا خسارہ برداشت کرنے کی مجھ میں نہ طاقت ہے نہ توفیق۔''

لیکن کارندے نے کچھ نہ مانا، اس نے نوٹ وہیں رکھے اور چلا گیا۔

رات کو ابراہیم سو نہ سکا، سوچتا رہا۔ کتنا ظلم ہے۔ بازار میں آلو سولہ روپے کے حساب سے بکتے ہیں اور مجھے چھ روپے کے حساب سے دینے ضروری ہیں۔ صرف اس لئے کہ بیوپاری نے مجھے فصل بونے سے پیشتر قیمت ادا کی۔ اس طرح سے وہ مجھے اپنی محنت کا

اندازہ ہی لگانے نہیں دیتا۔ آخراتنی محنت جو کرتا ہوں' کس لئے؟ اس لئے کہ اپنے خون سے بیوپاری کا پیٹ بھروں اور خود سوکھ کر کانٹا ہو جاؤں' پندرہ سال پہلے کُرتہ پہننے والا بدرالدین آج حاجی بن کر میرے ساتھ سودا کرنے کیلئے اپنے کارندے بھیجتا ہے۔ اور میں جہاں تھا' وہیں ہوں۔ نہ محمد ابراہیم بنا۔ نہ ابراہیم خان! نہ بدن سے میلا کُرتہ گیا۔ اور نہ کبھی نئ ٹوپی خریدنے کی توفیق ہوئی۔ اس نے میری محنت سے لاکھوں روپے بنائے صرف اس لئے کہ اپنی محنت کی قیمت دُنیا سے طلب کرنے کا مجھے شعور نہیں اور بیوپاری میری نااہلیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے دونوں دُنیا حسین بنا رہا ہے۔

صبح وہ اُٹھا۔ بیوی سے ملا۔ ''کل والے روپے کہاں ہیں''؟

بیوی نے پوچھا۔ ''کیا کروگے؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''میں بدرالدین سے سودا نہ کروں گا۔''

بیوی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیوں؟''

ابراہیم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''وہ قصائی ہے' مردار خور ہے اس کی سانس سے نعش کو بو آ رہی ہے۔''

بیوی خاوند کا غصہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ بولی۔ ''تم کو ہوش بھی ہے کہ نہیں''

ابراہیم نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''جب ہوش میں آؤں گا پھر تم ہی کیا' ساری دُنیا مجھے دیوانہ کہے گی' لا روپے!''

بیوی نے آہستہ سے کہا۔ ''اس جیسا بیوپاری نہ ملے گا۔ نہ لوٹاؤ روپے پچھتاؤ گے آخر اس کا کیا قصور ہے۔ اپنی تقدیر کو نہیں روتے جس نے ابھرنے نہ دیا۔''

ابراہیم کے سینے پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مارا' گرج کر کہا۔ ''تقدیر! اس نے مجھے چند چمکتے ہوئے سکے دیئے اور مبہوت کر دیا۔ مجھے کبھی بھی ابھرنے نہ دیا۔ پھر بھی وہ بیوپاری

ہے' فرشتہ ہے اور میں شیطان۔ جو اپنی محنت کے دام مانگ رہا ہے جو خیرات نہیں مانگتا۔ قیمت طلب کرتا ہے۔''

بیوی نے اُس کا مصمّم ارادہ دیکھ کر مٹی کی ہانڈی سے نوٹ نکالے اور اُس کے سامنے رکھ دیئے۔ ابراہیم نے نوٹ جیب میں ڈالے اور جاتے جاتے کہا۔ ''ہمیں بھی بدرالدین کی طرح آلو بیچنے کا ڈھنگ آتا تو ہمارے گھر پر بھی ہن برستا' ہم بھی حج کر آتے انسان کہلاتے' بھائیں بھائیں کرنے والی یہ ناداری یہاں ڈیرا ڈانے نہ رہتی۔ خون پسینہ ہم بہائیں اور ہاتھ رنگے وہ قصائی اور پھر دام طلب کرنے پر نخرے کرے۔

حاجی بدرالدین دکان پر تکیے کے سہارے قالین پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے دکان کے کارندے گذشتہ سال کا حساب کر رہے تھے۔ صرف آلوؤں کی تجارت میں انہیں ساڑھے گیارہ ہزار روپے کا منافع رہا تھا۔

اسی وقت ابراہیم آ گیا۔ رتبے کے مطابق ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

حاجی بدرالدین نے پیچوان کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ ''ساڑھے گیارہ ہزار روپے کا منافع کوئی بڑا منافع نہیں۔ مجھے پندرہ ہزار سے زیادہ کی توقع تھی۔''

کارندے ایک دوسرے کو حیرت بھری نگاہوں وے دیکھنے لگے۔ جیسے یہ سارا منافع ان ہی میں بانٹنے کے لئے تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بدرالدین نے ابراہیم سے پوچھا۔ ''آج کیسے آنا ہوا؟ سنا ہے تم نرخوں کے اضافہ پر بہت زور دے رہے ہو؟''

ابراہیم نے سر جھکا کر کہا۔ ''سچ ہے حضرت! اس سال میرا پیٹ بہت بڑا ہو گیا۔''

بدرالدین نے مسکرا کر طنزاً کہا۔ ''تو علاج کراؤ اس کا! آج کل ڈاکٹر عام ہو گئے ہیں۔''

ابراہیم نے زہر خندہ کیا اور اپنا غصہ آپ پی کر بولا......"جب آپ ایسے بزرگ ہم غریبوں کا یہی چاہیں تو ہمارے حق میں دعا کون کرے۔"

بدرالدین نے قہقہہ لگا کر دوسرا کش لگایا اور پھر ایک کارندے سے بولا۔"بڑا حضرت ہے۔ جب تک ہم سے پورے دام نہیں لیتا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

ابراہیم نے آہستہ سے کہا۔"جبھی آج بھی آیا ہوں کہ پیٹ بھر کر روٹی کھانے کی امید تو ہو جائے۔"

بدرالدین نے آہستہ سے اور سنجیدگی اختیار کر کے کہا۔"ابراہیم اس سال قیمت میں اضافہ نہ ہوگا۔ خُدا نے چاہا' اگلے سال اس پر سوچیں گے۔"

ابراہیم کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پچاس روپے کے نوٹ نکالے اور بدرالدین کے سامنے رکھے اور خود اٹھتے ہوئے کہا۔"اس سال سودا بھی نہ ہوگا حضرت! خُدا نے چاہا اگلے سال کریں گے"۔

حاجی بدرالدین اور دکان کے کارندے اسے حیرت بھی نظروں سے دیکھتے رہے اور وہ چلا گیا!

☆☆☆

ٹیکہ بٹنی

دُولھا منڈل پر کھڑا ہے۔ اوپر کمرے میں دُلھن کا سنگار ہو رہا ہے۔ پنڈ تانیاں رسیلی تانوں میں نا قابل فہم گیت گا رہی ہیں۔ آنگن میں براتی ہیں۔ مُحلے بھر کے لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ پروہت اور بھک منگے ہیں۔ کچھ ان میں سے خوش ہیں' کچھ مغموم ہیں اور کچھ حیران و پریشان۔ ایک لڑکی بیاہی جا کر وداع ہو رہی ہے۔ اس کے ماں باپ رحم جُو یانہ نظروں سے دُولھا اور دُولھا کے براتیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں...... "آج تک یہ لڑکی ہماری تھی' اب تمہاری ہو گئی ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ دینا۔ جہیز اور کُرم کے لئے تنگ نہ کرنا۔ یہ بڑی فرماں بردار بیٹی ہے۔ تمہاری سیوا ٹہل کو اپنی سعادت سمجھے گی اور سارا جسم تمہارے چرنوں میں گذار دے گی۔"

آج تک یہ لڑکی زندگی کے جس ڈگر پر چل رہی تھی۔ وہ شادی کے دوارے پر ختم ہو گیا۔ اب دوسری شاہراہ کی ابتدا ہے جس پر ماں باپ کا اختیانہیں، صرف ان کی دُعاوں کا سایہ پڑتا ہے۔ نئے ساتھی کا پیار ہوتا ہے' محبت ہوتی ہے' قہقہے ہوتے ہیں۔ زندگی اگر صرف یہیں ختم ہوا کرتی۔ تو یہ شاہراہ ابتداء سے انتہا تک حسین اور جوان نظر آتی۔ لیکن جُوں جُوں یہ لمبی ہوتی جاتی ہے۔ اس پر سنجیدگی' متانت اور فرض چھا جاتے ہیں اور ابتدا کے قہقہے کہیں کہیں آنسوؤں میں مبدل ہوتے ہیں اور کہیں کہیں...... پاتال تک چلے جاتے ہیں اور

پیار میں تھامی ہوئی باہیں اکثر ڈھیلی پڑتی ہیں......

مسلمان عورتیں ...... بوڑھی اور نوخیز...... آنگن کے ایک طرف پیار اور حیرت کے زیر اثر گا رہی ہیں۔ آنکھیں منڈل پر کھڑے دُولھا کو دیکھ رہی ہیں اور تصوّر سنگار ہونے والی دولہن کے اُس بچپن پر منڈلا رہا ہے، جو آج کے تھرتھراتے ہوئے سورج کے نکلتے ہی ختم ہو گیا۔ کل کی چھوکری پیار اور محبت، فرض اور رسوم سے بے خبر آزاد گلہری کی طرح دھان کے منڈیروں پر ناچتی تھی، گاتی جاتی۔ گاؤں کی کچی سڑک سے آنے والی ہر برات کو دیکھ کر ہنستی تھی، ان کا منہ چڑاتی تھی۔ آج پرائے مرد کیساتھ اسی کچی سڑک سے جا رہی ہے۔ اپنے ماں باپ سے وداع ہو کر، اپنی سہیلیوں سے منہ موڑ کر، اور دھا کی پیاری پیاری منڈیروں کو بھلا کر، دور ندی کے پار اس کے دولھا کا گھر ہوگا، جہاں اس کی ساس، نند اور دیور اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔ ندی کا پانی دودھ کی طرح میٹھا ہے لیکن دل بلور کی طرح سخت۔ یہ آر پار کے گاؤں کی ہر لڑکی کو، بچپن سے، ماں باپ سے، کھیتوں سے جُدا کرتی ہے۔

دلہن کا سنگار ہو رہا ہے اور مسلمان عورتیں آنگن میں گا رہی ہیں ۔

سڑکن وتھرے مشکہ کوفورو۔ عشقہ بمبُور ولیلہ آکھو

منڈل پر عشق کا بھنورا کھڑا ہے بھنورے کی لیلیٰ کا سنگار ہو رہا ہے اور ایک بوڑھا پروہت اپنی پوتی سے راز دارانہ لہجے میں کہتا ہے...... ''ٹیکہ بٹنی، جب تیرا دولہا میرے آنگن میں ہوگا......'' اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کے ذہن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور نو برس کی ٹیکہ بٹنی منڈل پر کھڑے متین صورت بھونرے کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ شاید سوچتی ہے یہ ان جانا، ان دیکھا دولہا کہاں سے آ کر ہماری گلہری کو چھین کر لے گیا؟ ہماری سہیلی اسے دیکھ کر روتی کیوں نہیں؟ اُس کے ماں باپ نے اس پرائے مرد کو گاؤں سے بھگا کیوں نہیں دیا؟ وہ اپنے بوڑھے دادا کی بات غور سے سنتی ہے۔ ''ٹیکہ بٹنی جب تیرا دولھا

میرے آنگن میں ہوگا......'' وہ یہ سننا چاہتی ہے کہ پھر کیا ہوگا' لیکن دادا اس سے آگے کچھ نہیں کہتا۔ وہ اوپر دیکھتی ہے جہاں دلہن کا سنگار ہو رہا ہے اور رنگارنگ پوشاک میں ملبوس پنڈتانیاں کھڑکیوں میں ایک دوسری کے اوپر جھکی ہوئی دولھا کو دیکھ رہی ہیں اور وہ دن یاد کر رہی ہیں جب ان کا دُولھا بھی اسی طرح آنگن میں منڈل پر کھڑا تھا اور مسلمان عورتیں ایک کونے میں گا رہی تھیں۔

سڑکن وتھرے مُشکہ کوفورد۔۔ عشقہ بمبورولیلہِ آکھو

وہ اس دن کسی قدر لرز رہی تھیں' ہر آہٹ پر چوکنّی ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب وہ سسرال پہنچیں اور انہوں نے اپنے نئے ساتھی کو دیکھا تو ان کا سارا خوف جاتا رہا انہیں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ساتھی کو جنم جنم سے جانتی تھیں۔ اگر بچپن ختم ہوتے ہی ان کے ماں باپ بھونرے تلاش کر کے نہ لاتے تو ان کی زندگی کتنی پھیکی اور بدمزہ ہو کر رہتی۔

گیت بدستور شوروشر کے ماحول میں گونجتا رہتا۔ ان گیتوں کا کیا مطلب ہے یہ ٹیکہ بٹّی نہیں جانتی' البتہ اس کا بوڑھا دادا جانتا ہے' اُس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔ بھاری بھر کم جسم جھوم رہا ہے اور زرد اور میلی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹ کانوں تک پھیل رہے ہیں۔ ہاں یہی زندگی ہے' یہی ایک لڑکی کی جنت ہے کہ اس کے ماں باپ اپنی پیاری بیٹی کے دولھا کو اپنے آنگن میں منڈل پر کھڑا دیکھیں اور کانوں سے بھنورے اور پُھول کا دِل نواز گیت سُنیں۔ اُسے اپنا بیٹا یاد آگیا جو آج سے چار سال پہلے اسے داغ مفارقت دے گیا تھا۔ اور اُس کے بوڑھے کاندھوں پر ٹیکہ بٹّی کا بوجھ ڈال گیا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا تو کبھی گاؤں میں آنے والی ہر برات کے پیچھے پیچھے اپنی پوتی کو لے کر چاول کے چاند لقموں اور سکے کے چند پیسوں کی خاطر نہ آیا کرتا۔ وہ براہمن ہے اور پروہت جو ہر اشٹمی کو کھیر بھوانی میں تانبے کے چند چھوٹے چھوٹے برتن پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹیکہ بٹّی چندن گھستی ہے۔ دادا

یاتریوں کو پوجا کراتا ہے اور جب پیسے بانٹنے کا موقع آتا ہے تو ٹیکہ بٹنی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ ''اسے بھی دو ججمان' یہ میری اکلوتی پوتی ہے اور بھگوتی کی پُجارن۔'' سارا دن وہیں بیٹھ کر وہ کچھ روپے بنا لیتا ہے اور پھر پوتی کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ ایسی برات اُترے گی کہ گاؤں میں نام رہ جائے گا۔ اتنے گہنے بنوا دوں گا کہ ہر لڑکی منہ تکتی رہ جائے گی۔ یکا یک اس کا خواب ٹوٹ جاتا ہے' ایک شخص اپنے ساتھی سے پوچھ رہا ہے...... ''یہ لوگ دُلہن کو کیوں نہیں لاتے' دولہا منڈل پر کھڑا تھک گیا ہے۔'' بوڑھا پروہت ہنستا ہے اور پوتی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے۔ ''سنتی ہو' کہتے ہیں دولہا منڈل پر کھڑا تھک گیا۔ دلہن کو لے آؤ۔''

''کہاں لے جائیں گے اُسے دادا''

''اپنے گھر بیٹی وہاں ندی کے پار......''

''کیوں دادا' اب وہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلا کرے گی؟''

بوڑھا زور سے ہنستا ہے۔ ''کھیل کود کا زمانہ بیت گیا بیٹی' کرم دھرم کرنے کے بعد لاش اور دلہن کو گھر میں نہیں رہنے دیا جاتا۔ یہی مریادا ہے' آج تک وہ ہماری بیٹی تھی۔ اب کسی کی بہو گئی۔ کسی کی دھرم پتنی' کسی کی نند اور کسی کی بھاوج۔ اب وہ عورت ہے بیٹی......عورت......جگت جننی جس نے رام کو جنا...... تمہیں اور مجھے جنا......''

ٹیکہ بٹنی حیران رہ گئی۔ ہماری گلہری ایک ہی چکر میں اتنی بڑی عورت بن گئی وہ دادا کے قریب آ کر اسے حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''لیکن دادا تم مجھے بھی عورت بنا دو گے؟''

دادا ہنس کر کہتا ہے۔ ''میں نہیں بناؤں گا بیٹی' زندگی بنا دے گی' زمانہ بنا دے گا۔ ہر بیٹی کو یہی عورت بناتے ہیں اور پھر رام اور بدھ اس سے مانگتے ہیں۔ ہی ہی ہی......''

لیکن میں ندی پار نہیں جاؤں گی دادا......ان براتیوں کے ساتھ جو رنگا رنگ پوشاک پہن کر آتے ہیں اور گاؤں کی لڑکیوں کو ڈولی میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔

''تو نادان ہے ٹیکہ بٹنی۔ ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی پڑتا ہے اور پھر ہم براہمنوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ ہم بڑے اُوتم ہیں ودیا پڑھنے اور پڑھانے والے' دان دینے اور لینے والے۔ لیکن تمہیں ڈر کا ہے کا؟''

ٹیکہ بٹنی اُن ہی متحیر نگاہوں سے دور بہنے والی خاموش ندی کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور سوچتی ہے۔ ''کیا یہ ندی چھوٹ جائے گی؟''

دادا اس کا مطلب تاڑ لیتا ہے۔ اس کے بے ترتیب اور میل سے اٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔ یہ ندی اسی طرح بہتی رہتی ہے۔ بیٹی یہ گاؤں کی لڑکیوں کو ہم سے جدا بھی کرتی ہے۔ لیکن ان کی جگہ نئی لڑکیوں کو بھی تو لاتی ہے۔ لیکن جب تو چلی جائے گی' تیری جگہ......نہیں کچھ بھی نہیں......اس کی آنکھوں میں آنسو کے دو قطرے چمکتے ہیں۔ کاش ٹیکہ بٹنی تیرا ایک چھوٹا بھائی بھی ہوتا جس کے لئے میں ندی پار سے چاند سی دلہن لاتا اور مرنے کے وقت تانبے کے سارے برتن اس کے حوالے کر کے کہتا۔ ''لو بیٹا اپنے دادا کی پونجی' جب اشٹمی آیا کرے تو کھیر بھوانی کے چشمے پر سلیقے سے انہیں پھیلا دینا اور ججمانوں سے کہنا......'' دادا چل بسے ججمان اور ٹیکہ بٹنی بیاہی گئی۔ اب سارے پیسے مجھے دو۔ میرے گھر میں ندی پار سے لائی ہوئی چاند سی دلہن بھی ہے۔''

میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی دادا۔ میرے بعد تمہارے پاؤں کون دھویا کرے گا۔ بستر کون بچھایا کرے گا اور پوجا کے برتن کون صاف کیا کرے گا......

بوڑھا زہر خند کر کے کہتا ہے۔ ''میرا کیا ہے بیٹی' میں پروہت ہوں۔ ایک اوتم براہمن۔ جہاں جاؤں گا' مان سے بیٹھوں گا۔ اور پھر دُنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ لڑکیاں

بیاہی جاتی ہیں۔ بوڑھے مرجاتے ہیں اور دروازوں میں تالے پڑ جاتے ہیں...... کہیں اُجڑے گھر بس جاتے ہیں اور کہیں بسے ہوئے گھر اُجڑ جاتے ہیں......''

''لیکن میں پھر بھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی دادا......''

اری ابھی سے کیوں گھلی جاتی ہو۔ ابھی چھ برس کی بات ہے۔ جب مجھے تمہارے لئے دولہا دیکھنا ہوگا' ایک اچھا سا دولہا......

ٹیکہ بٹنی کھل کھلا کر ہنس دیتی ہے اور بوڑھا بھی۔

سنگار ہونے کے بعد دُلہن کو سر سے پاؤں تک شال میں لپیٹ کر لایا گیا اور دولھا کے بائیں طرف منڈل پر رکھ دیا گیا' دلہن جھکی رہی اور دولہا سفیدے کی طرح اکڑ رہا...... لیکن آزاد گلہری! تُو بھی سیدھی کھڑی ہو جا' ورنہ کمر کا یہ خم زندگی بھر نہیں نکلے گا۔ کل تک تُو ایک بے خبر چھوکری تھی۔ لیکن آج تو عورت ہے۔ آج زمانے نے تیرے سر ایک چمکتا ہوتاج رکھا ہے۔ وہ تاج جس کی جگمگ کرنے والی روشنی میں مرد زندگی کے ڈگر پر ٹھوکر کھائے بغیر چلتا ہے۔ آج تُو اس رشتے میں پروئی گئی جس کے ہر دانے کی حفاظت کرنا تمہارا ایمان ہے۔ آج قدرت نے تمہارے حُسن اور شباب کی قیمت ادا کر دی۔ اور اس کا حق چُکانے کے لئے تمہیں ایسے بیٹوں کو پیدا کرنا ہے جو انسان بھیس میں لٹیرے نہ ہوں۔ سیدھی کھڑی رہ میری گلہری! اور دُنیا سے سر بلند ہو کر کہہ' مجھے یہ ذمہ داریاں منظور ہیں۔'' لیکن دلہن بڑی ضدی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نئی زندگی کو' نئے راستے کو' نئے ساتھی کو جُھک جُھک کر نمسکار کرتی ہے اور سیدھی کھڑی نہیں ہوتی۔ اس کے بدن کا دایاں حصہ دُولہا کے ساتھ چُھو رہا ہے' جو اپنے بدن میں برقی رو سی محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسا تناؤ جس کی تسکین نہ پنڈتانیوں کے ناقابل فہم گیتوں سے ہو سکتی ہے نہ مسلمان عورتوں کے دردناک گانوں سے' وہ اس منڈل سے پر لگا کر اُڑنا چاہتا ہے۔ اپنی دُلہن کو ساتھ لے کر' جسے ابھی

تک اس نے دل کھول کر بھی نہیں دیکھا جس کے مزاج سے' خیالات سے، عادات سے وہ ابھی واقف نہیں ۔لیکن اس بات کی ضرورت بھی کیا تھی ۔ جب کچھ بھی نہیں ملے گا' وہ اُسے چھوڑ کر دوسری شادی کرسکتا ہے' اسے ٹوکنے والا کون ہے' فرض اور ذمہ داریاں تاج اور رشتے 'حق اور قیمت سب کچھ لڑکیوں کے لئے ہے جو شاید اسی لیے نیم دائرے بن کر منڈل پر کھڑی زندگی کے نئے ڈگر پر قدم رکھتی ہیں کہ پاک منتروں سے ان کے جسم وجان کا اَن دیکھا مالک انہیں کہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔''

بوڑھا پروہت یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہے۔اس کی آنکھوں میں آج سے چھ برس بعد ہونے والا واقعہ پھر رہا ہے۔ ٹیکہ بٹنی کا دولہا منڈل پر کھڑا ہے۔ مسلمان عورتیں آنگن میں گیت گا رہی ہیں ۔

سڑکن وتھرے مُشکہ کوفو رو۔عشقہ مجنونو لیلہ آکھو!

ٹیکہ بٹنی شال میں لپٹی ہوئی نیم دائرہ بنا کر انگور کی بیل کی طرح لرز رہی ہے اور اندر ہی اندر دبی آواز میں دادا سے کہہ رہی ہے...... ''میں نہیں جاؤں گی دادا' مجھے مت جانے دو......'' دادا کی روح اپنی آغوش کھول کر اسے چھپانا چاہتی ہے۔اسے اس وقت اپنے الفاظ یاد آرہے ہیں۔ جو آج سے چھ برس پہلے اس نے معصوم ٹیکہ بٹنی کو گاؤں کی ایک لڑکی کے وداع ہونے پر کہے تھے۔تو نادان ہے بیٹی' ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی پڑتا ہے اور کرم دھرم کے بعد لاش اور دلہن گھر میں نہیں رہ سکتے......لیکن تو لاش نہیں' تو آج سے جگت جننی ہے' زمانے نے جو فرائض تم پر عائد کیے' ان کا حق ادا کرنا بیٹی۔اسے رام اور بدھ دینا' انسان کے بھیس میں لٹیرے نہ دینا' اسی سے میں لازوال بنوں گا اور تیری نسائیت جاوداں ہو کر رہے گی......''بوڑھا سب کی نظریں بچا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالتا ہے۔'' یہ آنسو بہانا اس وقت بُرا شگون ہے براہمن ۔ اپنی لڑکی کو آشیرواد دو ۔تمہاری جیبیں خالی سہی' گھر اجڑا ہوا ہی

سہی، لیکن تمہارے دل میں آشیرواد تو ہے، وہی اُسے دے دو۔ اس بن ماں باپ کی بیٹی کو، جس نے پندرہ برس تمہارے پاؤں دھوئے، برتن صاف کئے اور بستر بچھایا۔

بوڑھا اپنے منطقی وجود سے برسرِ پیکار ہے یہ بن ماں باپ کی بیٹی نہیں۔ اس کی ماں میں ہوں، باپ میں ہوں، بھائی میں ہوں۔ اسے بن ماں باپ کی بیٹی کہہ کر میرے زخموں کے ٹانکے مت کھولو۔ ''آج منڈل پر دُولھا دیکھ کر ان بند ٹانکوں سے آہستہ آہستہ خون رسنے لگا ہے لیکن تم سارے کے سارے ٹانکے مت کھولو''۔

''دُنیا ایسے ہی چلتی ہے براہمن، خون میں بو ہوتی ہے۔ جو جس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اسی کا ہوتا ہے۔ تم سب کچھ ہو کر بھی صرف دادا ہی ہو سکتے ہو۔ منڈل پر اس کا دولھا کھڑا ہے۔ ڈولی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے آشیرواد دو کہ جو چیز اسے تمہارے گھر میں نہ ملی۔ وہ اپنے خاوند کے گھر سے حاصل کر سکے؟''

''میں نے اسے سب کچھ دے دیا میری آتما، لیکن گہنے اور کپڑے...... میرا بیٹا...... وہ پھل والا بوٹا...... ایک بیج جو میرے حوالے کر کے سُوکھ گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا، دے دیا۔ پوجا کے برتن، میلا بچھونا بھکشا میں ائے ہوئے کپڑے...... اور یہ گھر...... یہ اب مجھے کس کام آئے گا، جب گھر کی روح ہی ڈولی میں بند ہو کر چلی جائیگی تو ڈھانچے کو سنبھال کر میں کیا کروں گا......''

آنگن میں گہما گہمی ہوتی ہے، گیت اونچے سروں میں گونجنے لگتے ہیں۔ ٹیکہ بٹنی دلہن کے قریب جا کر اسے دیکھنا چاہتی ہے لیکن وہ شال میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ دولہا کو خوف اور حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ شاید پوچھنا چاہتی ہے، تم میری گلہری کو کیوں لے گئے۔...... اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ جو تو ایک جماعت ساتھ لا کر اسے لے بھاگا۔ کیا ندی پار تمہیں کوئی ایسی لڑکی نہ ملی جسے تو اپنی دلہن بنا سکتا؟

وہ پھر حسین وجمیل منڈل کو دیکھنے لگی۔ جو ہلدی، چونے اور سات رنگوں سے بنایا گیا تھا اور جس کے نقش ونگار پر چار پاؤں...... دو مضبوط دو نازک...... زندگی کے نئے ڈگر پر چلنے کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ پاؤں سب سے پہلے اس ہلدی اور چونے والے منڈل پر ملتے ہیں۔ پھر ایک ساتھ اٹھتے ہیں، چلتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں۔ منڈل کے نقوش مٹ جاتے ہیں۔ لیکن ان نقوش کا طلسم نہیں ٹوٹتا۔ ٹیکہ بٹنی اپنے پاؤں دیکھتی ہے، غلیظ اور مکروہ۔ آج کتنے ہی دنوں سے وہ اس آنگن میں گھومتی رہی کبھی چاول کے لئے کبھی بھات کے لئے، کبھی چائے کے لئے اور کبھی پیسوں کے لئے۔ جبھی یہ اتنے میلے ہیں۔ لیکن ان پاؤں کے ساتھ کس کے دو پاؤں اور ملیں گے۔ مضبوط سے پاؤں...... وہ سوچتی ہے اور دادا اُسے دور سے بُلا رہا ہے۔ ''ٹیکہ بٹنی...... او ٹیکہ بٹنی!''

''کیا ہے دادا؟ ٹیکہ بٹنی دوڑ کر پوچھتی ہے''

''یہیں رہ بیٹی...... اب ہماری تمہاری باری ہے''

''کیوں دادا...... کیسی باری؟''

پگلی اب دولھا اور دلہن کے سر پر پیسے اور روپے آنے اور دونیاں پھینکی جائیں گی جتنی ہاتھ آئیں اٹھانا۔

''لیکن دادا، ایسا کیوں ہوتا ہے...... اور پھر روپے اور دونیاں؟''

یہ سارا جگت کپٹی ہے بیٹی۔ اور یہ پیسے پھینکنا بھی کپٹ ہے یہ لوگ ہمیں دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم مال دار ہیں...... مال دار...... لیکن بیٹی سب سے بڑا مال پیار ہے جو اس طرح پھینکا نہیں جاتا۔ اور جب تمہارا دولہا میرے آنگن میں آئے گا......''

''تب کیا ہوگا دادا؟'' پوتی معصومانہ انداز میں بڑے اشتیاق سے پوچھتی ہے۔

''تُو سنے گی...... سننا چاہتی ہے؟ بوڑھا ہنس کر کہتا ہے۔ میں تم پر پیار کی ورشا

کروں گا جو آج تک کسی نے نہیں کی ہے' پیسے ملیچھ اٹھاتے ہیں۔ پیار دیوتا لے جاتے ہیں۔

اور پھر ہم براہمن ہیں۔ اور تم پروہت......"

براتیوں میں سے ایک خوش پوش نوجوان نے رومال کا منہ کھولا۔ بوڑھے نے

اُسے دیکھ کر اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری۔

"اب تیار رہ بیٹی' میں اپنی چادر پھیلاؤں گا۔ تم دامن پھیلانا۔ اور پھر سب کے

سب پیسے......ہی ہی ہی ......" بوڑھے نے کہا۔ دونوں ہنسنے لگے۔ رام کرے اس رومال

میں بندھے ہوئے سارے پیسے اور روپے' آنے اور دونیاں ان کی چادر اور دامن میں

آ آ کر گریں۔

جب شنکھ بجنے لگے اور کھڑکیوں میں ایک دوسری پر جھکی ہوئی پنڈتانیوں نے

پھولوں کی ورشا کی۔ خوش پوش نوجوان کا ہاتھ ہوا میں لہرانے لگا۔ اور دولہا اور دلہن کے سر

کے اوپر اُڑ اُڑ کر سکے گرنے لگے اور ان کے ساتھ ہی مسلمان عورتیں بھک منگے اور بچے ان

پر بھوکے پرندوں کی طرح جھپٹنے لگے۔ آنگن میں ایک شور بے ہنگم اٹھا جس میں بوڑھا پر

وہت اور اس کی معصوم پوتی چادر اور دامن پھیلائے گم ہو گئے پھر ابھرے' پھر گم ہو گئے۔

بوڑھا جوں جوں سکے اٹھاتا جاتا تھا۔ اس کی زبان سے بے اختیار دعائیں نکلتی تھیں۔

"سدا سکھی رہو' جگت جننی بنو۔ سدا سہاگ وتی رہو' جُگ جُگ جیو......"

جب آنگن خالی ہو گیا اور مسلمان عورتیں' بھک منگے اور بچے اپنے پیسے الگ الگ

گننے لگے تو دادا اور پوتی ایک دوسرے سے ملے......

"کتنا ملا ہے؟" بوڑھے نے ہنس کر پوچھا......

پوتی نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک چھوٹا سا زرد سکہ دکھاتے ہوئے

کہا "یہ"

بوڑھے کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ فرٹے مو۔ کمینی! ''اتنی مایا میں سے صرف ایک ٹکہ؟''

ٹیکہ بٹنی نے رونی صورت بنا کر کہا...... ''جب میں پھینکنے والے کی طرف دامن پھیلا کر جاتی تھی۔ تو وہ دوسری طرف مُنہ کر کے سکّے پھینکتا تھا......''

بوڑھے کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اس کا سارا جسم پھڑکنے لگا۔ اس نے بے اختیاری کے عالم میں پوتی کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔

''رذیل لڑکی، براہمن لڑکی ہو کر تم اس کے پھینکنے کی طرف نہ تاڑ سکی...... کل کو جب تیرا دولھا آئے گا...... تب......''

ٹیکہ بٹنی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ شاید پوچھنا چاہتی تھی۔ تب کیا ہوگا۔ لیکن بوڑھا غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے ہڈی اٹک گئی تھی۔ وہ ان راستوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن پر دولہا کی سواری، بند ڈولی اور خوش پوش براتی قہقہے لگاتے ہوئے سگریٹ پیتے جا رہے تھے، دفعتاً اس نے پوری شدّت کے ساتھ کہا...... ''بدمعاش کہیں کے...... لفنگے......''

....

[1] ہم سڑکوں پر تمہارے لئے مشک کافور بچھا دیں گی۔ اے عشق کے بھنورے کیا تُو اپنی لیلیٰ کو لینے کے لئے آ گیا؟



☆☆☆

دیوتا کہاں ہیں

پنڈت رام ناتھ نے اپنے گھر میں بہت بڑے پیمانے پر ہون رچایا۔ گزشتہ منگل کو ہون کا مہورت تھا اور اس دن سے آج تک برابر ہون کنڈ روشن رہا۔ وید منتروں اور اشلوکوں کا اچارن ہوتا رہا۔ اور آج سنیچر کی شام کو خاتمے کی آرتی اترنی تھی۔ دیوتاؤں کو بھوگ چڑھانا تھا اور اس کے بعد برہمنوں کو مہان بھوجن دینا تھا۔

باغیچے میں ایک طرف عالی شان شامیانہ نصب کیا گیا تھا جس کے نیچے ہوَن منڈپ بنایا گیا تھا۔ دوسری طرف صحن کے ایک حصے کو کاٹ کر لنگر کھولا گیا تھا جہاں قسم قسم کے پکوان پک رہے تھے اور یہ سب کچھ دیوتاؤں کے لئے ہو رہا تھا جنہوں نے کچھ عرصے سے پنڈت جی کے کارخانے پر سونا برسانا شروع کیا تھا۔

زندگی کے شروع شروع میں رام ناتھ مذہب کا زیادہ معتقد نہ تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ دن اس کیلئے زندگی میں شامل نہیں تھے، صرف ایک ناکام سی جدوجہد زندہ رہنے کے لئے یا زیادہ سے زیادہ کارخانے کو چالو رکھنے کی خواہش...... یہ ہے ان دنوں کی داستان جہاں تیس دن کے بعد مشکل سے دو تھان ریشم کے بنے جاتے تھے۔ وہ بھی ایسے چار کاریگروں کے ہاتھوں سے جن کی آنکھوں میں ہر وقت زندگی بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔ رام ناتھ سارا سارا دن انہی کے پاس بیٹھا رہتا۔ جب کاریگر حقہ پینے بیٹھتے تو دوسرے دور کے

بعد چلم رام ناتھ کے ہاتھ میں پہنچ جاتی۔ وہ اپنے مستقبل کی رجائیت کا تصور کرتے ہوئے ہوا میں دھوئیں کے مرغولے پھینک دیتا۔ جو چھوٹے بڑے دائروں کی شکل میں آوارہ ہو جاتے۔ اور رام ناتھ کی نظریں ہوا میں تحلیل ہونے تک ان کا تعاقب کرتی رہتیں۔ ان ہی دائروں میں اسے اپنی اور اپنے چار کاریگروں کی زندگی پھیکی پھیکی سی نظر آتی، جو بالآخر غائب ہو جاتی...... کہاں؟ یہ وہ سمجھ نہ سکتا۔

لیکن یہ قیاس خود اس کے حق میں صحیح ثابت نہیں ہوا۔ اس کی زندگی کا دائرہ تحلیل ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ ایک اچھے کارخانے کا مالک بن گیا۔ جہاں اب چار کے بدلے پورے چالیس کاریگر جدید قسم کی مشینوں پر ریشم بنتے تھے اور جنگ کی وجہ سے پیراشوٹ کلاتھ کی اس قدر مانگ بڑھ گئی تھی کہ کارخانہ جمعہ کو بھی بند نہیں رہتا تھا۔

استا کریم اور اس کے ساتھی جنہوں نے رام ناتھ کے ابتدائی دن بے کیف سے کارخانے میں خاموش طریقے سے گزارے تھے، اپنی اور اپنے مالک کی اس حیرت انگیز ترقی پر وہ ہمیشہ فخر کرتے تھے ان کے خیال میں اس ترقی کا واحد سبب رام ناتھ کی نیت تھی جو انہیں ہمیشہ بلور کی طرح صاف اور چاندنی کی طرح پاکیزہ دکھائی دیتی تھی۔۔ اپنی نیت انہیں شاید ہمیشہ کوئلے کی کان کی طرح کالی اور بدصورت نظر آتی تھی۔ جبھی وہ چوبی نشستوں سے اٹھ کر سپرنگ والی نشستوں پر نہ بیٹھ سکے۔ لیکن پھر بھی انہیں مطلق افسوس نہ تھا۔ وہ دیوتاؤں کے قائل نہ تھے۔ البتہ دعاؤں پر بھروسہ کئے ہوئے تھے۔ جو کبھی کبھی بے اختیاری کے عالم میں ان کے منہ سے نکلتی تھیں...... ''یا اللہ ساگ بھتہ دے...... یا اللہ دین وایمان دے...... یا اللہ گھر میں بچے دے......'' اور پردہ نشیں خدا انہیں یہ دیتا رہا۔ ساگ بھتہ، دین وایمان اور بے شمار بچے......'' اس کے برعکس رام ناتھ کی زندگی کے دائرے بڑھتے رہے اور اتنے بڑھے کہ اسے مذہب سے عشق سا ہونے لگا۔ وہ جو آج تک صرف آسمانوں پر رہا کرتے تھے اور

اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اب اسے ہر جگہ ناچتے، کودتے، مسکراتے اور سونا برساتے نظر آنے لگے۔ مشینوں کے شور میں بھی اسے دیوی دیوتاؤں کی آوازیں، اُن کے اشارے، اُن کے فیاضی ہاتھ دکھائی دینے لگے...... دو اور لو۔ کھلاؤ اور کھاؤ مذہب ایک طرح کی تجارت ہے جو آسمانوں پر رہنے والا خُدا اپنے بندوں سے کرتا ہے جو اس بھید کو نہیں سمجھ سکتا...... وہ زندگی بھر ذلیل رہتا ہے اور ساری عمر چوبی نشستوں پر بیٹھ کر گذارتا ہے۔ تم پنڈت ہو، دوراندیش پنڈت، ایسے سستے سودے کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔

جب کسی سال ہون رچانے میں کچھ دنوں کا فرق پڑتا، تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے دیوتا ناراض ہو گئے ہوں اور نفع نقصان کی زبان میں کہہ رہے ہوں۔ ''یہ تمہارا اپنا قصور ہے، آسمانی بنئے کی تھیلیوں پر گرد کی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ تم اپنا مال بھیج دو، ہم اپنا مال بھیج دیں گے......'' اور یوں ہی ہوتا تھا، ہون رچایا جاتا تھا۔ روحانی تجارت کے دلال منتر پڑھتے تھے اور دوراندیس پنڈت سونے سے لد جاتا تھا۔

اور آج بھی شامیانے کے نیچے ہون جاری تھا، گھی شکر کی مہک سے ہوا معطر تھی......اور آگ کے شعلے دیوتاؤں کے بھیس میں ناچ ناچ کر آہوتیاں لے رہے تھے۔ چندن، توت اور چنار کی لکڑیاں چیخ چیخ کر جل رہی تھیں اور رام ناتھ کے چہرے پر ایک غیرت مرئی سا جلال پھیلتا جاتا تھا۔ تجارت چل رہی تھی۔ ترازو کا ایک پلڑا ہلکا تھا اور دوسرا بھاری۔ ہلکا پلڑا گھی، شکر اور منتروں کا مال لئے ہوئے تھا۔ اور بھاری پلڑا پیراشوٹ کلاتھ کے بھاری آرڈر لئے ہوئے جو رام ناتھ جیسے دوراندیش سوداگر کے اعتقاد کے مطابق صرف آسمان پر رہنے والے بنئے کی رضامندی کا ثبوت تھے۔ وہ کبھی کبھی منڈپ سے اٹھ کر صحن میں چلا آتا، اطمینان بھری نظروں سے لنگر کی طرف دیکھتا۔ پھر ان مزدوروں کی طرف جو صحن میں برتن مانجھنے، کتوں کو دور رکھنے اور صفائی کرنے کے لئے مامور ہوتے جو نہ

دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے اور نہ تجارت کے بھید کو سمجھ سکے تھے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ واپس اندر چلا جاتا اور آگ میں گھی اور شکر کی آہوتیاں دینے لگتا۔

صبح کو ہلکی سی بارش ہوئی تھی اور براہمنوں کے کہنے کے مطابق ہون کے لئے یہ بہت اچھا شگون تھا۔ تپتی ہوئی دھرتی کی حرارت کو کم کر کے آہوتی قبول کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ دیوتا ہون سے خوش ہو گئے ہیں اور یہ احساس صبح ہی سے رام ناتھ کو دلاتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوتاؤں کی ساری عقیدت سمٹ کر جمع ہو جاتی۔ وہ ہون کنڈ کی طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھتا۔ جہاں آگ کی لپٹیں ایک سالم قند کے گرد طواف کرتی نظر آتیں جو اپنی تمام مٹھاس آگ کے حوالے کر کے آہستہ آہستہ راکھ ہو جاتا۔ اور رام ناتھ کے لئے آسمانوں سے دیوتاؤں کی خوشنودی لے آتا۔ اس منظر کو دیکھ کر رام ناتھ کے دل میں جلتے ہوئے قند کے لئے تھوڑی دیر کے واسطے ہمدردی پیدا ہو جاتی۔ اور آگ سے نفرت سی۔ جس کی لپٹیں بڑی بے دردی سے قند کی زندگی چوس لیتیں۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنے دیوتا یاد آتے۔ اور پھر آگ مقدس بھی تو ہے' ایک براہمن کی طرح اور پھر وہ خود بھی تو ایک براہمن ہی ہے...... جس نے آج تک کسی کی زندگی کی مٹھاس نہیں چھینی۔ البتہ دیوتاؤں نے اس کی زندگی میں خود بخود مٹھاس بھر دی...... اس کے چار کاریگر...... راکھ کے راکھ ہی رہے۔

شامیانے کے نیچے ہون ہو رہا تھا اور باہر صحن میں ایک لڑکا اندھے بھک منگے کا ہاتھ پکڑے داخل ہوا۔ اور صحن کے ایک طرف اسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا۔ لڑکے کی نظریں سازوسامان اور گہما گہمی دیکھ کر آوارہ ہونے لگیں اور اندھے کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ معطر ہوا نے شاید اس کے جذبات کو جگا دیا۔

برتن مانجھنے والے ایک مزدور نے انہیں دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں خون اتر

آیا۔ ''حرامی......مفت خورے سنگھ سونگھ کر عین موقع پر پہنچ جاتے ہیں''

وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا۔ پھٹ کر لڑکے سے بول ''کیوں اس بے چارے کو ذلیل کر رہے ہو' مزدوری کیوں نہیں کرتے''

لڑکے نے مزدور کا غصہ دیکھ کر اندھے کا ہاتھ زور سے پکڑا۔ اور مزدور پھر بولا۔ جالے جا اسے یہاں شام کو چاول ملیں گے۔''

اندھے نے اپنا سر اسی طرف اونچا کر کے کہا'' بابا ہم تھوڑی دیر ٹھہریں گے' کچھ ملے گا تو لیں گے۔ نہیں تو چل دیں گے۔''

''شام تک ٹھہرو گے؟'' مزدور نے دوسرا سوال کیا۔

لڑکے نے سر سے اثبات کا اشارہ کیا۔ لیکن اندھے نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں بادشاہ! دور ٹھکانہ ہے۔''

''دُور......؟ کہاں؟''

''عیدگاہ کے پاس، علم صاحب کی مسجد میں۔''

اتنے میں ایک نوجوان بھکارن اپنی گود میں نیم برہنہ بچہ اٹھائے ہوئے صحن میں داخل ہوگئی۔ مزدور نے اسے دیکھا تو حقارت سے ہنسنے لگا۔

بھکارن لڑکے کے پاس آکر بیٹھ گئی اور استعجاب بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کا نیم برہنہ بچہ کیچڑ سے کھیلنے لگا۔

''کب بھات ملے گا؟'' اُس نے دفعتاً بھک منگے لڑکے سے رازدارنہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا معلوم...... کہتے ہیں شام کو......'' لڑکے نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''شام کو......؟''

''کیوں تمہیں بُھوک لگی ہے؟''

''مجھے نہیں......اس بچّے کو......!''

تو جا کر مانگ لانگری سے......شاید دے دے۔

نوجوان بھکارن خاموش ہوگئی۔ مانگنے کے لفظ نے اسے چپ کرادیا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ عورت خدا کی وہ تخلیق نہیں جو اپنا ہاتھ پھیلا کر کسی سے کچھ مانگے۔

اور اسی بھک منگے نے اُسے اکساتے ہوئے کہا۔ ''جا مانگ لے......تمہیں دے دیں گے۔''

نوجوان بھکارن نے بچے کو گود میں اٹھایا اور لنگر کی طرف چل دی۔ بیسیوں پکوان اس کی نظر کے سامنے آ گئے......پوریاں......کھیر......بھات' پکوڑیاں لڈو......

بچے نے اتنی چیزیں دیکھ کر کیچڑ سے بھرا ہوا اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اور مچل کر گود سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور ماں خاموش مگر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اندر دیکھنے لگی۔

ایک لانگری نے اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا چاہتی ہے؟''

''تھوڑا سا بھات اس بچے کے لئے......اس نے کہا۔''

''بھات؟'' ''ہاں صبح سے بھوکا ہے......''

لانگری نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ایک خاموش مگر شکست خوردحُسن جو غلیظ پوست اور کپڑوں کے اوپر لاوارث مال کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ ایک البیلی جوانی جو ممتا کے سبب ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ ایک شرمیلی عورت جو بیگانگی سی محسوس کرتی ہے اور آپ ہی آپ لرز رہی ہے۔

''یہ بچہ تمہارا ہی ہے؟'' لانگری نے ہمدردی کے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......'' بھکارن نے شرما کر جواب دیا اور خاموش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ شاید دل میں سوچنے لگی۔ بھات کی ایک رکابی کے لئے رشتے دریافت کرنے کیا

ضروری ہیں...... کیا اس دنیا میں بھکاریوں کی خیرات بھی پوچھ گچھ کے بغیر نہیں مل سکتی؟

تھوڑی دیر بعد لانگری نے کہا۔ ''تم بیٹھ جاؤ۔ جب دیوتاؤں کا بھوگ چڑھے گا، میں تمہیں سب سے پہلے پیٹ بھر کر بھات کھلاؤں گا۔''

ابھی وہ وہیں کھڑی تھی کہ منڈپ سے رام ناتھ باہر نکلے۔ لنگر کے دروازے پر بھکارن کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے...... ستیاناس ہو گیا۔ ملیچھ عورت......

بھکارن تھرتھرانے لگی۔ اس کا بچہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھات اور پوریوں کی طرف اشارے کرتا رہا۔ اور ایک مزدور نے ڈانٹ کر اسے صحن میں بٹھا دیا۔ ''چڑیل ...... مالزادی...... حرامی بچے کو لے کر سر پر چڑھی جا رہی ہے۔''

عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... رام ناتھ لانگری سے کہہ رہے تھے ''دیوتاؤں کے پکوان پر ملیچھ عورت کی نظر تو نہیں پڑ گئی......؟''

لانگری لاکھ لاکھ قسمیں اٹھا کر یقین دلا رہے تھے کہ اس کی نظر کسی چیز پر نہیں پڑی...... اور تمام پکوان کی تقدیس بدستور قائم ہے......''

رام ناتھ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے...... اور بھکارن سرنگوں ہو کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بھک منگے لڑکے نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا کہا لانگری نے''

''تم نے نہیں سنا؟ بھکارن نے پوچھا۔'' ''نہیں اللہ قسم!''

''نہیں دیا...... بولا...... پہلے دیوتا کھائیں گے...... ان کے بعد تمہیں ملے گا......''

''دیوتا......؟ وہ کون ہوئے؟'' لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''مجھے کیا معلوم......''

اندھا بھکاری ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں انہیں جانتا

ہوں۔ وہ شام کو آتے ہیں۔"

"شام کو......؟" بھکارن نے گھبرا کر پوچھا۔

ہاں ......شام کو......وہ دن کو نہیں آتے......" اندھے نے خود اعتمادی کے لہجے میں کہا۔ جیسے فی الحقیقت اس نے دیوتاؤں کو دیکھا تھا یا اُنہیں جانتا ہو۔

اور جُوں جُوں تاریکی پھیلنے لگی۔ وہ ہر آنے والے کو غور سے دیکھنے لگے۔ شاید یہی دیوتا ہو۔ لیکن جو آتا تھا وہ یا تو بھک منگا تھا...... یا انسان____ مانُوس سا انسان!"

اندھیرا چھا جانے کے بعد بھی جب لنگر میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی دی۔ تو لڑکے نے اندھے سے پُوچھا۔ "ابا۔ دیوتا کیوں نہیں آتے......؟"

اندھے نے سنجیدگی سے کہا۔ "آئیں گے بیٹا' ضرور آئیں گے۔ پنڈت کے ہر بڑے دن پر دیوتا آتے ہیں۔"

نوجوان بھکارن کا بچہ روتے روتے سو گیا تھا۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کیچڑ کے داغ سوکھ گئے تھے جو دھرتی کی مٹھاس محسوس کر کے اس نے کھا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک مزدور ان کے پاس سے گزرا۔ اندھے نے پوچھا۔ "کیوں بھائی' بھات کب ملے گا؟ اب تو شام بھی ہو گئی......"

مزدور نے قدم روک کر کہا۔ اوہو' بڑے نازک مزاج ہو......

بھکارن اس جواب سے بہت مایوس ہو گئی...... کاش وہ ماں نہ ہوتی۔ اس کا بچہ بھوک کی وجہ سے زیادہ دیر تک نہ سو سکا۔ وہ جاگ کر رونے لگا اور بار بار لنگر کی طرف اشارے کرنے لگا۔ اندھے نے اپنے بیٹے سے بادل ناخواستہ کہا۔ "میرا ہاتھ پکڑو' چلو چلتے ہیں......"

لڑکے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دونوں صحن سے نکلے۔

بھکارن مضطرب ہو کر صحن میں ٹہلنے لگی اور جب اسے بھات تقسیم ہونے کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ اور نہ دیوتا آتے ہوئے نظر آئے تو وہ بھی دروازے کی طرف بڑھی۔

اندر شامیانے کے نیچے اونچی آواز میں شانتی پاٹھ ہو رہا تھا اور باہر ایک مضطرب اور مجبور ماں اپنے بھوکے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی صحن سے نکل رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر رُک رُک کر، مُڑ مُڑ کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دیوتا نہیں آئے جو اتنی بڑی تقریبوں پر سب سے پہلے بھات اور پکوان کھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بے زبان بھوکے بچّے سے بھی پہلے!

وہ گویا ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہی تھی۔ دیوتا کہاں ہیں؟ دیوتا کہاں ہیں؟



اِمام صاحب

صُبح ہی سے پانی برس رہا ہے اور اِمام صاحب کھڑکی پر بیٹھے مایوس نگاہوں سے اپنی خستہ حال مسجد کو دیکھ رہے ہیں۔ جس کی کھڑکیاں بند ہیں' دروازہ بند ہے اور جو بارش میں ایسے نظر آ رہی ہے جیسے کوئی مفلس بیمار شفا خانے کے باہر بھیگی ہوئی دیوار کے نیچے اُونگھ رہا ہو۔ مسجد کی چھت سے نہ جانے کتنا پانی اندر ٹپکا ہوگا' اس خیال کے آتے ہی امام صاحب تڑپ اٹھے۔ انہوں نے لاٹھی اٹھائی اور مسجد کی طرف گئے۔ ان کی بیوہ بیٹی جسے وہ خانہ نشین بنا چکے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہولی اور اس کا بیٹا نیم عریانی کی حالت میں بے اختیار رونے لگا۔

امام صاحب نے مسجد کا دروازہ کھولا۔ چاروں چٹائیاں پانی سے بھیگ گئی تھیں' باپ بیٹی ایک دوسرے کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں اب کیا ہوگا' نمازی کہاں بیٹھیں گے؟ بیٹی نے جواب کا انتظار کئے بغیر چٹائیاں لپیٹ لیں اور دیوار کے سہارے کھڑی کیں۔ امام صاحب کو اطمینان سا ہوا۔ وہ دروازے کے باہر دوزینوں والی سیڑھی پر بیٹھ کر ستانے لگے۔ آج جمعہ تھا اور اسی دن انہیں پانچ چھ روپے کی آمدن ہوتی تھی۔ لیکن آثار بتا رہے تھے کہ آج کوئی بھی شخص نماز پڑھنے کے لئے نہیں آئے گا۔ اس خوف کا احساس باپ بیٹی کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ مگر دونوں خاموش

تھے۔ بڑھاپے اور جوان داماد کی بے وقت موت نے امام صاحب کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی بینائی خراب ہو چکی تھی، توانائی نے جواب دے دیا تھا۔ لیکن بیٹی اور پوتے کی محبت انہیں زندہ رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ انہوں نے بیٹی کو دوسری شادی کرنے پر بہت زور دیا تھا۔ مگر بیٹی نے بوڑھے باپ کو بے آسرا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ''یہ چند برس کے صبر کی بات ہے جب بچہ ریشم خانہ کی مزدوری کے قابل ہو جائے گا۔'' اسی امید پر امام صاحب جی رہے تھے۔ ان کا بوڑھا اور افلاس زدہ دماغ وقت سے پہلے ہی بچے اور سارے خاندان کے مستقبل کے متعلق سنہرے جال بنا کرتا تھا۔

امام صاحب بدقسمتی سے کچھ زیادہ لکھے پڑھے بھی نہ تھے۔ بچپن میں انہوں نے قرآنِ مجید کا درس لیا تھا اور حدیث کی موٹی موٹی باتیں حفظ کی تھیں۔ یہی ان کا سرمایہ تھا۔ فطرتاً وہ کم گو اور تنہائی پسند تھے۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ضرورت سے زیادہ زمانے کا اتار چڑھاؤ دیکھا تھا۔ شروع ہی سے غم اور افلاس، بھوک اور عریانی اب ان کا سارا اثاثہ خستہ حال مسجد کی امامت تھی جو شہر کے بالائی حصّے میں انہوں نے اپنے ہی مکان کے صحن میں بنوائی تھی اور جہاں چند سرکاری دفتروں کے ملازم اور راہ گیر ہر جمعہ کو نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ انہیں باپ کی طرف سے ایک پرانا چوغہ وِرثے میں ملا تھا۔ پشمینے کا بنا ہوا جس پر کہیں کہیں ریشم کی کشیدہ کاری تھی۔ اس میں ہر چند بے شمار سوراخ تھے مگر امام صاحب اسے کبھی نہ پہنتے تھے۔ یہ صرف جمعہ کو مسجد کے اندر کھونٹے پر لٹکایا جاتا تھا۔ لوگ نماز ادا کرنے کے بعد اس کی جیبوں میں کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ جب مسجد خالی ہو جاتی تو وہ آہستہ سے چوغا اٹھاتے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلے جاتے، چوغے کی جیبوں کے وزن سے وہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ اس میں کتنے کی ریزگاری ہوگی جو کسی بھی صورت میں چھ سات روپے سے زیادہ نہ نکلتی۔ دونیاں، چونیاں، آنے، ٹکے اور بعض اوقات ایک آدھ نوٹ بھی روپے کا، جس

پر تین شیروں کی چھاپ ہوتی۔ اسی ریزگاری سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد امام صاحب دو زینوں والی سیڑھی سے اٹھے اور آہستہ آہستہ اوپر چلے گئے، ان کا دل ڈوبا جارہا تھا، اگر آج نماز کے لئے کوئی نہ آیا تو......

گیارہ بجے کے قریب بارش رُک گئی اور آسمان پر پھیلے ہوئے بادل میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے۔ امام صاحب کی جان میں جان آ گئی، ان کی آنکھیں ناچنے لگیں، ہونٹ لرزنے لگے، ان میں جیسے نئی جوانی عود کر آئی۔ ''مہریؔ'' انہوں نے پکارا۔ ''بادل چھٹ رہے ہیں، جا کر مسجد میں چٹائیاں بچھا دو۔''

مہریؔ نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ واقعی بادل چھٹ رہے تھے اور آسمان صاف ہو رہا تھا۔ امام صاحب سے اب نہ رہا گیا۔ وہ چوغہ اٹھا کر پھر نیچے آ گئے۔

مسجد میں چٹائیاں بچھ گئی تھیں۔ وہ اب بھی گیلی تھیں۔ لیکن اس کا کیا ہے جو لوگ خُدا کے حضور میں جھکتے ہیں وہ سردی اور گرمی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

ایک بجے کے قریب نمازی آنے لگے۔ امام صاحب نے کھونٹے پر چوغہ لٹکایا۔ آنے والے سب جانے پہچانے تھے۔ ڈاک خانہ کے کلرک، تار گھر کے بابو، بنک کے ملازم، آس پاس کے چند ہانجی اور دوسرے لوگ سب کی زبان پر بارش کی شکایت تھی۔ اگر کچھ دیر اور جاری رہتی تو شاید نماز بھی ادا نہ ہوسکتی۔

امام صاحب امامت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان کے پیچھے دو قطاریں لگ گئیں اور قطاروں کے پیچھے جوتوں اور بوٹوں کی قطار......

نماز ادا ہو گئی۔ مسجد سے نکلتے نکلتے کئی ہاتھ کھونٹے پر لٹکتے ہوئے چوغے کی جیب میں گئے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو جوتے پہن کر مسجد سے نکلے۔ امام صاحب کی نگاہیں ایسے لوگوں کا تعاقب دور تک کرتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد مسجد خالی ہوگئی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد امام صاحب نے کھونٹے سے چوغہ اتارا۔ مسجد کا دروازہ بند کیا اور گھر کی طرف چلے گئے۔ آج چوغے کی جیبیں انہیں ہلکی محسوس ہوئیں۔ ان کا دل غوطے کھانے لگا۔ مہری کھڑکی پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ لیکن باپ کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر اس کی مسکراہٹ فوراً ایک یاس انگیز سنجیدگی میں بدل گئی۔ اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ چوغے کی جیبوں سے جو کچھ نکلتا ہے' امام صاحب گننے کے بعد اسے طاقچے پر رکھ دیتے ہیں۔

امام صاحب نے جوتی اُتاری' لاٹھی ایک طرف کو رکھ دی اور کھڑکی کے برابر بیٹھ گئے۔ انہیں بہت ملال تھا کہ کچھ نمازی چوغے کا خیال کئے بغیر ہی چل دئے تھے ایسے لوگوں کو نہ خُدا کا خوف ہوتا ہے نہ اوروں کی مفلسی سے ہمدردی مگر یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے' دُنیا نفسا نفسی کا دوسرا نام ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد امام صاحب کا کانپتا ہوا ہاتھ چوغے کی جیب ٹٹولنے لگا دائیں جیب سے وہی نکلا جس کا اندازا نہوں نے لگایا تھا' تین روپے ساڑھے بارہ آنے۔ دوسری جیب بالکل ہلکی تھی۔ پھر بھی مام صاحب نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس میں ڈالا۔ اس میں سے ایک بڑا نوٹ نکلا۔ امام صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ کچھ لمحوں تک وہ فیصلہ ہی نہ کر سکے کہ یہ کیا ہے اور کیسے آگیا۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے گھبرا کر بیٹی کو آواز دی...... "یہ دیکھ رہی ہو' جیب سے نکلا ہے۔"

مہری نے نوٹ لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولی۔ "نوٹ ہے لیکن میں نے آج تک اتنا بڑا نوٹ نہیں دیکھا ہے۔"

"آج کے نوٹ نئے ہوتے ہیں بیٹی:...... یہ پرانا ہے' انگریز کی تصویر نہیں دیکھ رہی ہو؟" امام صاحب نے کہا۔

اس سے کیا ہوتا ہے، نوٹ ہی تو ہے۔'' بیٹی نے بضد پوچھا۔

''تم نہیں جانتی۔ اب انگریز کہاں، جو ان کا سکہ چلے، انہیں تو ملک سے نکال دیا گیا ہے۔'' امام صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''تب......؟'' مہرؔی سر سے پاؤں تک ایک سوال بن گئی۔

کسی نے مذاق کیا ہے، جیب میں کھوٹا نوٹ ڈال دیا۔''

''ان لوگوں کو خدا کا خوف بھی نہیں رہا۔'' مہرؔی نے کہا۔ ''مسکینوں سے بھی مذاق کرتے ہیں۔''

''زمانہ بہت بُرا ہو گیا ہے بیٹی۔''

''کسی کو تو دکھا دو، شاید چل جائے۔ مہرؔی نے کہا۔''

امام صاحب چونک پڑے، ان کے ہونٹوں پر تھرتھری سی چھا گئی...... ''کیا کہا کسی کو دکھا دوں، جانتی بھی ہو، کھوٹا نوٹ رکھنا بہت بڑا جرم ہے جسے دکھادوں گا، وہی کلائی پکڑ کر تھانے پہنچا دے گا۔''

مہرؔی کانپ اٹھی۔ ایک بار اس کے مرحوم شوہر کو پولیس کسی الزام میں پکڑ کر لے گئی تھی، آٹھ دن تک مار پیٹ ہوئی۔ پھر پچاس روپے دے کر گلوخلاصی ہوئی۔

مہرؔی کچھ اور نہ کہہ سکی۔ نوٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گلا بھرا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد امام صاحب نے پھر نوٹ ہاتھ میں اُٹھایا اور اسے بڑی توجہ سے دیکھتے رہے۔ کاش یہ نوٹ آج سے چھ برس پہلے ان کے چوغے کی جیب سے نکلا ہوتا تو گھر کے کتنے ہی اخراجات پورے ہو جاتے۔ مہرؔی کے لئے کریپ کا پیرہن اور شلوار آتا، مسجد کی مرمت ہوتی، بچے کا ختنہ ہوتا اور دودھ کے لئے بکری آجاتی۔ مگر آج اتنی چھاپوں اور اتنے نشانوں کے باوجود یہ نوٹ

ایک کاغذ کے پرزے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ انگریز جا چکے تھے۔ اُن کا سکہ جا چکا تھا، ان کی عمل داری جا چکی تھی ...... یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ یہ بات امام صاحب کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے نوٹ پر چھپی ہوئی تصویر یہ کہہ رہی ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے، قصور ان کا ہے جنہوں نے میرے سکے اور میری حکومت کا خاتمہ کیا اور ملک کے لئے آزادی مانگی۔

امام صاحب کے دل میں نفرت کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پچھلی جنگ کا زمانہ پھرنے لگا، جب بنڈ پر انگریز ہی انگریز نظر آتے تھے۔ خوش اور خورم، ٹماٹر کی طرح لال اور چکنے، جو پانی کی طرح دولت خرچ کرتے تھے مگر اب ...... اب تو کچھ بھی نہیں۔ بنڈ پر نہ چہل پہل ہوتی ہے نہ قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ وہ کسی افیونی کی طرح لیٹا ہوا ہے اور لوگ خاموشی سے اسے روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ افیونی نہ حرکت کرتا ہے نہ احتجاج۔ جیسے اس کی غیرت ہی مر چکی ہے۔

کانونٹ کے کلاک نے چار بجائے۔ امام صاحب ریز گاری کو طاقچے پر رکھ کر اٹھے۔ ان کے ہاتھ میں نوٹ تھا۔ انہوں نے مذاق کرنے والے کا کھوج لگانے کا عزم کیا۔ مگر جب وہ کچے پُل پر پہنچے تو ان کے قدم خود بخود رک گئے۔ سوچنے لگے، کہاں تلاش کروں کس سے پوچھوں۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ سے بنڈ پر آ گئے۔ اور نئی چنی ہوئی پست دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ اُس امید پر کہ شاید مذاق کرنے والا خود بخود معافی مانگنے کے لئے آ جائے۔ امام صاحب اس سے جھگڑا نہیں کریں گے، البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ ایسے لوگوں مذاق نہیں کرتے جن کی روحیں تک غم اور افلاس میں ڈوبی ہوئی ہوں۔

شام تک کوئی نہ آیا۔ ویسے جانے پہچانے لوگ سلام علیک کہہ کر چلے گئے مگر کسی نے نوٹ کا نام نہ لیا۔

دیے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں بھی امام صاحب یہی سوچتے رہے اور جب وہ بجھ گئی اور میلی سی چاندنی کمرے کی ایک کھڑکی سے اندر داخل ہوئی تو امام صاحب کھڑکی پر آبیٹھے۔ ان کے پاس ایسی چیز تھی جو وہ نہ کسی کو دکھا سکتے تھے۔ نہ اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ اسے ضائع کرنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ ممکن ہے کبھی کبھار مذاق کرنے والے کا پتہ چل جائے' اسی سوچ میں رات نکل گئی۔ اُن کے پپوٹے بوجھل ہو گئے تھے ان کا انگ انگ ٹوٹ گیا تھا' پھر بھی وہ صحن میں آکر کسی کا انتظار کرنے لگے۔ کبھی ٹیلے پر کبھی مسجد کے اندر چلے جاتے کبھی آنکھوں کا خمار کم کرنے کے لئے منہ ہاتھ اور پاؤں دھو لیتے۔

معاً دوپہر کے بعد ان کے دل میں ایک خیال آ گیا۔ انہوں نے نوٹ کو پیرہن کی جیب میں چھپایا' لاٹھی ٹیکتے ہوئے نکلے۔ پل کو عبور کیا۔ بنڈ پر چڑھے اور بنک کی طرف چلے گئے۔ وہاں ان کا ایک مرید تھا جو ہر جمعہ کو مسجد میں نماز پڑھنے آیا کرتا تھا' ہر چند وہ کل نہیں آیا۔ تاہم امام صاحب کو اُس پر کامل بھروسہ تھا۔

بنک میں کافی بھیڑ تھی' سنیچر کی وجہ سے بنک ایک آدھ گھنٹے کے بعد بند ہو رہا تھا اور لوگ بنک بند ہونے سے پہلے ہی فارغ ہونا چاہتے تھے۔

دروازے پر سنتری نے امام صاحب کو روکا۔ ''بابا یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بنک ہے۔''

امام صاحب نے اوپر سے نیچے تک اپنے آپ کو دیکھا اور پھر ایک نامحسوس مزاحمت کے جذبے سے متاثر ہو کر کہا...... ''میں گداگر نہیں ہوں' مرید سے ملنا چاہتا ہوں''

سنتری انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ شاید اسے اعتبار نہ آیا' پھر بھی اس نے مزاحمت نہ کی اور امام صاحب پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ وہ اتنی بھیڑ اور اتنے روپے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ساتھ ہی انہیں یہ خوف بھی لاحق ہوا کہ کہیں کوئی

ان کی جیب میں کھوٹا نوٹ نہ دیکھ لے۔ وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتے رہے کہ اچانک دور سے آواز آئی...... ''امام صاحب!''

امام صاحب کا دل ربڑ کی گیند کی طرح اُچھلنے لگا۔ انہوں نے آنکھوں کے اوپر داہنا ہاتھ پھیلا کر دیکھا۔ ان کا مرید انہیں بلا رہا تھا۔

''آپ یہاں کیسے امام صاحب؟'' وہ کونٹر سے باہر نکل کو پوچھنے لگا۔

کچھ لمحوں تک امام صاحب کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ پھر انہوں نے مرید کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ کہے بغیر بنک سے باہر لے گئے۔

''خیر تو ہے امام صاحب؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''خیر ہے' ایک کام آپڑا ہے۔'' امام صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ان کا دایاں ہاتھ خود بخود پیرہن کی جیب میں گیا۔ ''کل کسی کم بخت نے کھوٹا نوٹ دیا ہے' وہی دکھانے آیا ہوں۔'' ''کھوٹا......؟ کتنے کا ہے......؟''

امام صاحب کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ انہوں نے کہا۔ ''دکھا دوں گا' لیکن کسی سے نہ کہنا۔ میں پولیس سے بہت ڈرتا ہوں۔''

مرید ہنس کر کہا۔ ''وہاں تک بات ہی نہ پہنچے گی' آپ دکھایئے تو......'' امام صاحب نے اس کی ٹھوڑی چھو کر منت کی۔ ''میرے بڑھاپے پر رحم کرنا۔'' آپ یہ کیا کر رہے ہیں امام صاحب؟ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیئے مرید نے ہمت دلاتے ہوئے کہا۔

امام صاحب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مرید کے ہاتھ میں نوٹ تھما دیا۔

''یہ......؟ یہ تو سو روپے کا نوٹ ہے امام صاحب۔''

''ہاں ہاں سو روپے کا' مگر یہ کھوٹا نہیں۔ مرید ہنس کر کہا۔''

''کھوٹا نہیں......؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' امام صاحب سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے

جلد جلد پوچھا۔ مگر اس پر انگریز کی تصویر ہے یہ کھرا کیسے ہوسکتا ہے''۔

''یہ باتیں آپ نہیں سمجھ سکتے' آپ یہیں ٹھہریئے۔''مُرید نوٹ ہاتھ میں لیکر اندر چلا گیا۔ امام صاحب کی نبضیں چھوٹنے لگیں۔ وہ اوپر سے نیچے تک پسینے میں شرابور ہو گئے۔ اطمیان دلائے جانے کے باوجود انہیں محسوس ہونے لگا جیسے ابھی ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیا پڑنے والی ہیں۔ ابھی پولیس کے سپاہی انہیں گھسیٹ کر تھانے کی طرف لے رہے ہوں گے۔ پھر مار پیٹ ہوگی۔ سوالات پوچھے جائیں گے۔ یہ نوٹ کہاں سے آیا' کب آیا' کیوں آیا'......اور ان باتوں کا جواب امام صاحب کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

انہوں نے بنک سے بھاگنے کا بھی قصد کیا اور ابھی پھاٹک تک ہی پہنچے تھے کہ پیچھے سے مرید نے پکارا۔''امام صاحب!''

امام صاحب کے قدم رک گئے۔ مرید نے نزدیک آ کر ایک ایک روپے والے سو نوٹوں کا نیا بنڈل ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔''یہ لیجئے امام صاحب' آپ کا کھوٹا نوٹ بنک نے رکھ لیا ہے۔''

امام صاحب اتنے نوٹ لینے سے گھبرائے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ہاتھ پھیلا دیا اور بنڈل لے لیا۔ مرید نے ہنس کر پوچھا''مگر یہ نوٹ دیا کس نے تھا؟''

امام صاحب نے اپنے حواس بجا کرتے ہوئے جلد جلد کہا۔''دیا کسی نے نہیں یہ اپنا ہی ہے......بالکل اپنا......''

یہ کہہ کر وہ واپس چلے آئے۔ بنڈ پر پہنچ کر انہوں نے کھدر کی چادر سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے گئے۔ آتے وقت یہ راستہ چند لمحوں میں طے ہوا تھا۔ مگر اب جیسے یہ راستے لمبے ہو رہے تھے' ان کا دل دھڑک رہا تھا' ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ وہ بچ بچ کر چل رہے تھے کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''مہرآ ئی نوٹ کھرا تھا...... یہ دیکھ لو۔'' مہرآ ئی نے نوٹوں کا بنڈل دیکھا تو خوشی سے دیوانی ہوگئی اور امام صاحب نے جلد جلد کہا۔ ''اب کوئی مجھ سے ملنے آئے تو کہہ دینا امام صاحب گھر میں نہیں ہیں' گاؤں چلے گئے ہیں' نہ معلوم کب واپس آجائیں گے۔''

مہرآ ئی نے حیران ہوکر باپ کی طرف دیکھا اور امام صاحب نے پھر کہا۔ ''خبردار کسی کو یہ نہ کہنا کہ میں یہیں ہوں۔ بچے کو بھی منع کر رکھنا۔''

''تو کیا آپ سچ مچ گاؤں چلے جائیں گے؟'' مہرآ ئی نے پوچھا۔

''نہیں' گاؤں میں میرا کون ہے''۔ امام صاحب نے جواب دیا۔ کمرے کی کھڑکی بند کی اور چادر اوڑھ کر سو گئے......



کاریگر

شو رُوم کی وُسعت میں سجائی ہوئی چیزوں سے وہ بظاہر اپنے مذاق کے مطابق ایک چیز کا بھی انتخاب نہ کر سکا۔ اُسے تپائی، ٹیبل لمیپ اور سگریٹ کیس سے زیادہ ایک سِنگار بکس کی ضرورت تھی۔ لیکن ڈیزائن...... وہ خود بھی نہ جانتا تھا کی کون سا پسند کرے۔ بار بار اپنی بیوی کا معطر خط نکال کر پڑھتا تھا جس میں لکھا تھا...... ''چیزیں بے حد خوبصورت اور جاذب نظر ہوں، بلخصوص میرا سِنگار بکس......''

''بے حد خوبصوت اور جاذب نظر'' کے صحیح معنی تلاش کرنے کے لئے اُس نے بار بار اپنے دِماغ کے پوشیدہ کونے چھان ڈالے۔ لیکن وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ پانچ سو میل دُور سے فرمائش بھیجنے والی بیوی نے ان لفظوں کو کس پیرایے میں لیا تھا۔ اگر اُس نے تول کر سنگار بکس کی فرمائش کی ہے تو شو رُوم ایسی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ صاف اور سُتھرے سنگار بکس کی پالش سے جگمگا رہے تھے اور مالک دُکان کی حریص نگاہیں اور چرب زبانی اُسے بہت کچھ خریدنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ لیکن وہ خود نفسیات کا مُعلم تھا۔ اُسے اپنے معیا اور اپنے پیمانے میں اُس جگہ ہر چیز کو تو لنے کا حق تھا۔ جہاں اُس کی مخروطی اُنگیوں والی بیوی نہ تھی۔ اسی لئے مالک دُکان کی حریص نگاہوں کی ہنسی اُسے پھانسنے میں ناکام رہی۔ کیونکہ اُس کے نزدیک حسن صرف رومانی تصور کا دُھندلا سا نقش تھا جس میں وہ اپنی زندگی اپنے

محسوسات اور اپنے مذاق کا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ سکتا تھا۔ یہاں نہ اُنگلیوں کی وضع قطع، نہ پوست کی بے نُور رنگت اور نہ آنکھوں کی بے کیفی کو دخل تھا۔ سِنگار بکس کا تحفہ اُسے اپنی بیوی کو پیش کرنا تھا۔ جس کے حُسن میں وہ دراصل اپنے رومانی تصوّر کی عکاسی دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

''مجھے کوئی ڈیزائن پسند نہیں ......!'' اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہی......ہی......ہی!'' دُکان کا مالک غیر ارادی طور پر ہنسا شورُوم کی ساری وُسعت وحشیانہ قہقہے سے لرز اُٹھی۔ پھر وہ اُس کے قریب آ کر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ ایک دراز قد جنٹلمین جس کے چہرے کی بدصورتی کو چیچک کے ناتراشیدہ داغوں نے دوبالا کر دیا تھا۔ جس کی گھنی مونچھیں ہونٹوں کے پاس سگریٹ کے کثرت استعمال سے زرد ہونے لگی تھیں۔ جس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ چمکیلی لیکن عزم مستحکم لئے ہوئے تھیں۔

مالک دُکان نے شورُوم کا سرسری نگاہوں سے جائزہ لے کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''عجیب بات ہے صاحب! ہم نے اپنی طرف سے مشرقی اور مغربی دونوں مذاقوں کے مطابق چیزیں تیار اور فراہم کر رکھی ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ یہ دیکھئے یہ ٹیبل لیمپ! کنول کے پتوں میں پوشیدہ یہ ڈنٹھل، یہ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں۔ یہ پھُول ......ہی......ہی یہ مغربی آرٹ کی طرز پر بنایا گیا ہے انگریز لوگ اس ڈایزائن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ لیمپ دیکھئے۔ مہاتما بدھ اسے تھامے ہوئے ہیں۔ یہ مغربی آرٹ کی طرح پوشیدہ نہیں۔ عیاں ہے عیاں۔ اور حضور جب یہ روشن ہوتا ہے تو بُدھ کا مجسمہ منوّر ہو اُٹھتا ہے آپ شاید اسے پسند کریں گے، بڑی اچھی چیز ہے!''

نفسیات کے معلّم نے مشرقی آرٹ کی طرز پر بنا ہوا لیمپ ہاتھ میں لیا۔ سچ مُچ اس

میں مغربی آرٹ کی طرح کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی۔ مہاتما بدھ کے پتلے پتلے لکڑی کے ہاتھوں میں وہ ڈنڈی تھی جس کے اُوپر ہولڈر لگا ہوا تھا۔ اس میں نہ ڈنٹھل تھے نہ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی زیرِ آب مچھلیاں۔ ہر چیز واضح، عیاں اور مکمل تھی۔

اُس نے سوچا۔ ''یہ کشمیری صنّاع بھی کس قیامت کے ذہین ہوتے ہیں۔ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا تضاد...... پوشیدہ اور عیاں کس خوبصورت انداز میں لکڑی کے پالش شدہ ٹکڑوں پر پیش کیا ہے۔ اس میں کتنی گہرائی، کتنی صدیوں کی عظمتِ پارینہ کی جگر خراش حسرت۔ کتنے معانی اور کتنی رنگین خیالی ہے۔ مغرب کی تہذیب پوشیدہ! ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیوں کی طرح محتاج اور غیر مکمّل! اور مشرق کی تہذیب، مذہب کے دِل فریب سایوں میں پروردہ، واضح اور مکمّل!''

یہ کس نے بنایا ہے۔ میرا مطلب ہے کس کاریگر نے؟ اُس نے سنجیدہ لہجے میں مالک دُکان سے پوچھا۔

مالک دُکان کی پلکیں جن کے نیچے حرص و ہوا کی روپہلی لکیر سی بہہ رہی تھی۔ جلد جلد جھپکنے لگیں۔ اُسے یقین ہوگیا کی خریدار مشرقی آرٹ کا ٹیبل لمیپ خریدنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ بولا...... ''ہمارے کارخانے کے ایک معمّر کاریگر نے......آپ دیکھیں گے اِسے حضور بڑا نیک نیّت آدمی ہے اور پچیس سال کا تجربہ کار۔ چیز کہہ دو بس ٹھیک بنا دیتا۔ بیس اُنیس تک فرق نہیں ہوتا۔''

نچلی منزل کے ایک مختصر سے کمرے میں جہاں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی، ایک معمّر انسان میلی سی شلوار میں ملبوس کسی چیز پر سنگِ خارا سے پالش کر رہا تھا۔ تانبے کی طرح سیاہی مائل سُرخ جسم کی ہڈیاں گنی جاسکتی تھیں۔ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ پیٹ پر قدرت نے آگ کے قلم سے نقش و نگار بنائے تھے۔

مالک دُکان نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ مام دِینا'' اور پھر نفسیات کے معلّم سے کہا۔ ''یہ ہے صاحب ہمارے کارخانے کا تجربہ کار کاریگر جس کے ہاتھ کی بُنی ہوئی چیزیں نیویارک، لندن، وی آنا اور استنبول تک پہنچ گئی ہیں۔''

نفسیات کا معلّم اور حسین سنگار بکس کا خریدار ٹھٹھک گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے بدمذاق اور غیر آراستہ کمرے میں بیٹھے ہوئے نیم عُریاں انسان نے اُس کے غرور کو جھٹلا دیا۔ جو شاید مغرب اور مشرق کی تعریف تک سے نامحروم تھا جسے شاید اِتنا بھی معلوم نہ تھا کہ ان پچیس سالوں میں دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لیکن جو اِسی کمرے میں آج سے کئی برس شہتیر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر اپنے آہنی قلم سے تہذیب انسان کی بدلتی ہوئی لافانی تصویریں بنا رہا تھا...... مام دِین نے قلم ہاتھ سے رکھا اور چہرے پر اطمینان کی مُسکراہٹ پھیلا کر بولا...... ''سلام حضور!''

نفسیات کا معلّم ''سلام حضور'' سُن کر چونک پڑا۔ اُس نے مصنوعی طور پر ہنس کر کہا۔ ''سلام!''

وہ اپنی پتلون کو اوپر کھینچ کر کاریگر کے پاس بیٹھنے لگا۔ شاید دیکھنے کے لئے کہ وہ کس چیز پر پالش کر رہا ہے۔

مالک دُکان نے جھٹ اُس کا ہاتھ روکا کہا۔ ''ہائے ہائے! کہاں بیٹھا چاہتے ہیں حضور! یہ جگہ...... یہ...... ناصاف ہے! مام دین بھی خریدار کی اس بدتہذیبی پر گھبرا اُٹھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیمتی لباس میں ملبوس جنٹلمین کے برابر بیٹھ جائے۔ وہ کھونٹی سے کپڑے کی چادر اُتارنے کے لئے دوڑا تاکہ سے چٹائی پر بچھا کر ناصاف جگہ کو خریدار کے بیٹھنے کے قابل بنا سکے اور نفسیات کے معلّم کو بھی نہ جانے کیا یاد آیا۔ اُس نے پتلون کو پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ناصاف جگہ...... نفسیات کا معلّم! کارڈ مخمل کا پتلون...... عزّت، شہرت!''

مالک دکان اُس کا بدلتا ہوا ارادہ تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا۔ ''حضور آپ کس جگہ بیٹھنے لگے تھے۔ اگر آپ یہ چیز دیکھنا چاہتے تھے تو ہم اسے دفتر میں منگا سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ہماری بے عزّتی ہے کہ ایسی مشہور دُکان پر آیا ہوا خریدار ایک معمولی کاریگر کے پاس بیٹھے اور اس چٹائی پر...... ہاہاہا......''

نفسیات کا معلّم دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا۔ مام دین کا وجود بھی ایک حُسن ہے۔ دماغی حُسن جو جسمانی حُسن سے بالکل مختلف ہے اور بے پروا......اور مشرقی آرٹ کی طرح واضح، عیاں اور اپنے سے مطمئن......!

اُس نے مالک دُکان کی باتیں توجّہ سے سُنی تھیں۔ تاہم اُس نے کہا۔ ٹھیک ہے ۔ٹھیک ہے''۔

مالک دُکان نے وہ لکڑی کا ٹکڑا دِکھایا جسے مام دین رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔ ''یہ ایک انگریز کی فرمائش ہے حضور! ایک سگریٹ کیس آج پندرہ دِن کے بعد تیار ہو گیا ہے۔ یہ دیکھیے باریک کام۔ یہ بیل بُوٹے کس محنت اور جانفشانی سے اُبھارے گئے ہیں اور پھر ان ہی بیل بوٹوں میں یہ چھوٹا سا مونا گرام (W.D) وِلیم ڈیوس!''

وہ اُسے غور سے دیکھتا رہا اور مام دین کی سُوکھی سُوکھی ٹانگیں میلی شلوار میں کانپنے لگیں......کانپنے لگیں، کہیں یہ جنٹلمین نقش ونگار میں کوئی نقص نہ نکالے۔

وہ کبھی کبھی مام دین کی طرف بھی اپنی ضرورت سے زیادہ چمکیلی آنکھوں سے دیکھتا گیا۔ اُسے اُس کے سُوکھے بدن میں صرف حُسن ہی حُسن، نزاکت ہی نزاکت، رنگینی ہی رنگینی نظر آئی۔ تجربہ کار کاریگر۔ جس کے دماغ کا حسن اب بھی وِتی آنا اور استنبول کی عالی شان عمارتوں کی زینت بنا ہوا تھا۔ لیکن جو خود میلی سی شلوار میں ایک بدمذاق کمرے کی چٹائی پر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے مالک دُکان سے پوچھا۔ ''اس سگریٹ کیس کی کیا قیمت ہوگی......؟''

مالک دُکان نے مام دین کی موجودگی میں ہی مُسکرا کر کہا۔ ''واجبی دام ہیں حضور! آپ سے رعایت ہی ہوگی۔ دراصل انگریز لوگ قیمتوں کی اُلجھنوں میں زیادہ نہیں پڑتے۔''

اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر بھی ہم سے کیا لیں گے؟''

مالک دُکان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''انگریز سے ساٹھ روپے۔ اگر آپ پسند کریں تو صرف پینتالیس روپے!''

معلّم کے دماغ میں دوبارہ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا تضاد گھومنے لگا۔ انگریز اسے ساٹھ اور ہندوستانی سے پینتالیس پوشیدہ اور عیاں محتاج اور واضح!

وہ زور سے ہنسا بہت زور سے حتیٰ کہ لرزتا ہوا مام دین بھی دبی دبی مُسکراہٹ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ ''انگریز سے ساٹھ اور مجھ سے پینتالیس...... ہاہا...... ہا......''

پھر اُس نے مام دین سے کہا۔ ''اُستاد ہمیں ایک سنگار بکس کی ضرورت ہے۔ جس پر کوئی خوبصورت سی چیز ہو۔ میرا مطلب ہے ہمارے مذاق کے مطابق۔ بیل بُوٹے نہیں، ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں نہیں۔ بس کوئی جانور، کوئی پرندہ، اُڑتا ہوا، بھاگتا ہوا آزاد اور مسرور، خوبصورت اور جاذب نظر! سمجھ گئے......؟''

مام دین کے مالک نے دُکان کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اچھی بات ہے حضور۔ بنا دوں گا۔ انشاء اللہ آپ پسند کریں گے!

اُس نے پھر کاریگر کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً چڑی مار، عقاب باز، شیر ببر یعنی جس کا شعار آزادی ہو، جس کا مقصد...... جس کا مقصد بس آزادی ہو۔

؟ صرف آزادی ہو...... سمجھ گئے؟''

مام دین کی بے کیف آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ اُس کے بے نُور چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولا۔ سمجھ گیا حضور۔ زندگی یہی سمجھتے سمجھتے گزر گئی۔ یہی بناتے بناتے گزر گئی۔ یہی عقاب اور باز، چڑی مار اور شیر، بدھ اور کنول۔ لیکن آپ مطمئن رہیں، حضور کی چیز ان سب سے نرالی ہوگی......

نفسیات کے معلّم نے لمبی سانس کھینچی۔ ذہنی کوفت کا وہ ارتعاش جو اُس کی رُوح تک کو چھو چکا تھا، ختم ہوگیا۔ ایک نرالی چیز ......نہ عقاب نہ باز......صرف آزادی کے صحیح معنی لئے ہوئی نئی تصویر جس کا عکس صرف مام دین کے رومانی تصوّر پر پڑ چکا تھا اور نفسیات کا معلّم اُس سے بے خبر تھا...... مطلق ناواقف!

اُس نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''اگر چیز ہماری پسند کی ہوگی تو ہم تمہیں انعام بھی دیں گے!''

اور پھر انعام کا معیار قائم کرنے کے لئے اس نے شکارے میں بیٹھ کر مالک دُکان سے پوچھا۔ ''اس کاریگر کی روزانہ اُجرت کتنی ہے؟''

مالک دُکان نے مُسکرا کر کہا۔ ''حضور پہلے تو بارہ آنہ تھی، اب پورا روپیہ لیتا ہے۔ حساب کے معاملے میں بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔''

شکارے میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا رہا۔ انگریز سے ساٹھ، ہندوستانی سے پینتالیس اور حساب کے معاملے میں بڑے ڈھیٹ کاریگر کو صرف پندرہ روپے، جس کے نام کی بنیاد تک زمانے نے رگڑ رگڑ کر مٹا دی ہے۔ جسے شاید اس کا بھی احساس نہیں کہ اُس کے اصلی نام کا مفہوم کیا ہے اور اب شہرت یافتہ لیکن مخفی نام کا مطلب کیا......!

دس دِن کے بعد وہ پھر کارخانہ میں آ گیا۔

مام دین اُس کے سنگار بکس پر سنگ خارا سے پالش کر رہا تھا۔

اُس نے دیکھا۔ سنگار بکس پر ایک اژدہے کی تصویر کھدی ہوئی ہے جو منہ کھولے کسی شیر کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔

وہ مسرّت سے جھوم اُٹھا "واہ واہ! خوب چیز ہے" اُس نے مالک دُکان سے کہا "بالکل میرے مذاق کے مطابق آزاد، بے پرواہ اژدہا...... جو تہذیب کا قائل نہیں، جو مذہب کا پروردہ نہیں۔ جو صرف آزاد ہے...... آزاد۔"

مام دین اپنی چیز کی تعریف سُن کر خوشی سے تھرتھرانے لگا۔ اُس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔

نفسیات کا معلم ایک نظر سے سنگار بکس کو دیکھ رہا تھا اور دوسری نظر سے دماغی حسن کے سراپا مجسّمے کو...... معاً اُسے محسوس ہوا جیسے اژدہے کی چوبیں آنکھوں میں نفرت، کش مکش اور انتقام کی بے پناہ آگ دہک رہی ہے اور جیسے وہ سارے کُرہ ارض کو ڈسنے، اپنے زہر سے تباہ و خاکستر کرنے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔

اُس نے کتنی ہی دیر تک مام دین کے چہرے اور نحیف جسم کی طرف خاموش مگر لرزاں نگاہوں سے دیکھا۔ لحہ بہ لحہ اُسے شک ہوا۔ یہ اژدہا نہیں، یہی کانپتا ہوا مام دین ہے۔ یہی معمر کارگر۔ یہی تانبے کی طرح سیاسی مائل سُرخ اور نیم عُریاں انسان جو انگریز اور ہندوستانی، مغرب اور مشرق، تہذیب اور مذہب سبھوں سے اپنا انتقام لینے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔

اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

بے اختیار ہو کر اُس نے کہا۔ "مام دین!"

"جی حضور!"

"....مام دین......ما......م......دین۔" اُس نے زیادہ بے تابی سے کہا۔

حضور کیا بات ہے۔ ڈیزائن پسند نہیں؟ مام دین نے کانپتے کانپتے پوچھا۔

"بہت اچھا ڈیزائن ہے۔ بہت اچھا۔ لیکن ہمیں معاف کردو۔ معاف کردو۔ ہم نے تمہیں پہنچانا نہیں۔ مغرب اور مشرق۔ انگریز اور ہندوستانی سب کو معاف کردو۔ سب کو بخشو۔ اپنا پھن سمیٹ لو۔ اپنا زہر نگل جاؤ......"

وہ جلد جلد سیڑھیاں اُترا اُس کی سانس پھول چکی تھی۔ رگ رگ پھڑک رہی تھی۔ چمکیلی آنکھوں میں یاس پھیل گئی تھی اور مُنہ سے تعفّن سا آرہا تھا۔

"ہمیں معاف کردو۔ بخشو۔ ہم بے گُناہ ہیں۔ زمانے کو ڈسو! تہذیب اور مذہب سے انتقام لو۔ لیکن ہمیں بخشو۔ بخشو! معاف کردو!۔"

اور مام دین اپنے کمرے کی کھڑکی سے کہہ رہا تھا۔ "حضور میرا انعام! اے حضور......اے حضور انعام!"

مالک دُکان دونوں کی سراسیمگی اور دیوانگی پر حیران ہو رہا تھا!

☆☆☆

جُھنجھنا

گنگا دھر کئی لحاظ سے خوش قسمت ہے، پہلی خوش قسمتی یہ ہے کہ نوجوان ہے اور ایک سرکاری محکمے میں مستقل چپراسی ہے۔ تنخواہ صرف بارہ روپے ہے مگر مہنگائی کا الاونس اٹھارہ روپے ملتا ہے، دوسری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کے دو بڑے بھائی ہیں، واسدیو اور آفتاب رام۔ یہ بھی شادی شدہ ہیں، حالانکہ دیہات میں رہنے والے ہندوؤں کو آسانی سے گھر گرہست میسّر نہیں ہوتا، انہیں یا تو ہزاروں روپے کی پگڑی دینی پڑتی ہے یا عمر بھر کنوارا رہنا پڑتا ہے۔ تیسری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کے دونوں بھائی گاؤں میں تھوڑی بہت دکانداری بھی کرتے ہیں، تھوڑی بہت جعل سازی بھی، اس طرح سے گنگا دھر پر گھر کا زیادہ بوجھ نہیں۔ ایک اور خوش قسمتی یہ ہے کہ تینوں بھائی اب تک ایک ساتھ رہتے ہیں، حالانکہ دیہات میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ تین بھائی کماتے ہوں اور اکٹھے رہتے ہوں۔ عام طور پر ایسے ہندو گھرانوں میں کئی طرح کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وراثت کے، زمین کے، عورتوں کے، مگر لال پور کا یہی ایک ہندو گھرانہ ہے، جہاں اتفاق ہے اور جہاں تینوں بھائی ایک دوسرے پر مرتے ہیں۔ گنگا دھر چونکہ سب سے چھوٹا ہے اس لئے وہ ضرورت سے زیادہ فرمانبردار ہے، وہ واسدیو کو اپنا باپ سمجھتا ہے اس لئے خوش قسمتی یہ ہے کہ تینوں بھائی صاحب اولاد ہیں۔ واسدیو کا لڑکا ہے چھ برس کا، آفتاب رام کی بیٹی ہے، تین برس کی اور گنگا دھر کا

لڑکا ایک سال کا۔ دکان کا سارا کام آفتاب رام چلاتا ہے۔ واسدیو وہاں بہت کم بیٹھتا ہے' اس کا کام گھر کا انتظام چلانا ہے یا گاؤں میں بے مطلب گھومنا' اوروں کی نکتہ چینی کرنا' وہ زبردست قسم کا باتونی اور یاوہ گو ہے، جسے وہ دانائی سے منسوب کرتا ہے۔ وہ ہر صبح گاؤں کے شوالے میں زور زور سے منتر پڑھتا ہے جس سے اس کی مذہبی حیثیت سی قائم ہوگئی ہے۔

آفتاب رام بحیثیت انسان برا نہیں مگر اس کی زبان گندی ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے گالیاں بکتا رہتا ہے۔ خریدار ایک پیسہ کم ادا کرے تو دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ سے غلیظ سی گالی نکل جاتی ہے۔ کئی بار جھگڑا بھی ہوتا ہے' ہاتھا پائی تک تو بت پہنچ جاتی ہے مگر بیچ بچاؤ سے معاملہ دب جاتا ہے' دکان کا یہ شیر گھر میں دبیل جانور کی طرح رہتا ہے نہ بدمزاجی نہ گالی گلوچ۔ واسدیو کا اسے اتنا احترام ہے کہ اسکی موجودگی میں نہ حقہ پیتا ہے نہ دیوار کے سہارے پیٹھ لگائے بیٹھتا ہے اور نہ بیوی بچے سے بات کرتا ہے۔ اگر خدانخواستہ بچی کا ہاتھ بھی جل جائے یا وہ سیڑھیوں سے گر جائے' کیا مجال آفتاب رام اسے اٹھانے کے لئے دوڑے ایسے موقعوں پر واسدیو اندر ہی اندر اپنے میں ایک عجیب بزرگی سی محسوس کرتا ہے۔

گنگادھر بھی شرم وحیا میں کچھ کم نہیں۔ چھوٹا ہونے کے سبب بڑوں کی تابع داری اس کے فرائض میں شامل ہے' دوسرے بھائیوں سے اخلاقی طور پر بہت اونچا اور برتر ہے۔ وہ نہ بدکلام ہے نہ جعل سازی۔ دفتر سے تنخواہ لیتا ہے تو مہنگائی کے اٹھارہ روپے دوسرے ہی دن منی آرڈر کر کے گھر بھیج دیتا ہے۔ کبھی کبھار چھٹی ملتی ہے تو ہفتہ عشرہ کے لئے گھر چلا جاتا ہے۔ لیکن اب شیواتری آرہی ہے پچھلے چار مہینے سے وہ گھر نہیں گیا ہے۔ اب بڑی مشکل سے پانچ مہینے کی چھٹی ملی ہے' گھر جانے سے ایک دن پہلے اس نے بہت سی چیزیں خریدیں' ساگ' سبزی' ندرو' پالک' مرغابیاں' سبز چائے' ریشمی ونکہ پن' خوشبودار صابون کی

ٹکیاں، بچوں کے لئے سرمے کی بوتلیں، کریپ کے پیرہن، آفتاب رام کی بیٹی کے لئے کھوٹے کلابتوں کی ٹوپی اور لکڑی کی رنگ دار سینڈل، واسدیو کے بیٹے کے لئے سلا سلایا کرتا، اپنی بیوی بچے کے لئے اس نے کچھ بھی نہیں خریدا۔ اسے ان کے لئے کچھ خریدنے کا خیال تو آیا، مگر اس خوف سے کہ بھائی اسے بے حیا نہ سمجھیں۔ اس نے ارادہ ترک کر دیا، البتہ چلتے چلتے منیاری کی دوکان سے ٹین کا ایک جھنجھنا ساڑھے تین آنہ میں خریدا اور اندر کی جیب میں ڈال دیا۔

ساری رات اسے نیند نہیں آئی۔ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ جسم سرکاری کواٹر کی ایک مریل سی کوٹھڑی میں تھا، مگر روح سرشام ہی لال پور پہنچ چکی تھی، سوچتا تھا، بچہ اب چل پھر سکتا ہوگا، باتیں کرتا ہوگا۔ بیوی میکے سے آگئی ہوگی، گائے نے بچھڑا جنا ہوگا۔ گاؤں کا سارا ماحول بدل چکا ہوگا، یہ چار مہینے بھی ایک زمانہ ہوتا ہے۔ طویل اور صبر آزما بچے، بیوی اور گھر کی معیت اس کے دل میں ایک تلاطم بن کر اٹھی، جو تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ گھر پہنچ جاؤں گا تو ساری رات بیوی سے باتیں کروں گا۔ بچے کو سینے سے لگا کر سو جاؤں گا، بیوی چیزوں کا گلا کرے گی تو دو روپے کا نیا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دوں گا۔ کتنی خوش ہوگی وہ...... ایک دم سے دو روپے پھر جس طرح چاہے خرچ کرے، دودھ پیئے، صابون خرید لے سرمہ لگا لے، جو چاہے کرے آخر اسے بھی مجھ پر حق ہے۔ اس خیال سے اسے روحانی سکون سا محسوس ہوا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

گھوسیوں کے مرغ نے بانگ دی تو گنگا دھر جاگ اٹھا۔ اب بستر میں پڑا رہنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا، دیا جلایا، حجامت بنائی، صابون سے ہاتھ منہ دھویا۔ سندور کا قشقہ لگایا اور سامان باندھنے لگا۔

لال پور کے اڈّے پر صرف ایک تانگہ کھڑا تھا۔ کوچوان اور گھوڑا دونوں فروری کی

سردی سے اکڑ گئے تھے، سڑک کے کناروں پر جمی ہوئی برف کی کئی تہیں تھیں جن پر طرح طرح کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ پاس کی مسجد میں درود خوانی ہو رہی تھی اور حمام کے بدرو سے بھاپ اٹھتا ہوا پانی منجمد نالیوں میں بہہ رہا تھا۔

گنگا دھر نے اپنی گٹھڑیاں ایک طرف کو رکھ دی اور پوچھا۔ ''کیوں چودھری ابھی کتنی دیر ہے؟''

لال پور سرینگر سے بارہ میل دور تھا۔ گنگا دھر عام طور پر پیدل چلا جاتا تھا، مگر آج بوجھ کے سبب ایسی صورت نہ تھی۔ کوچوان نے چونک کر کوئی سے سر نکالا۔ اور پوچھا۔ ''کتنی سواریاں ہو؟''

''صرف ایک......لال پور جانا ہے۔''

''تو بیٹھ جاؤ، ذرا دم لو، سوریاں آئیں گی تو ان شاء اللہ چلیں گے۔''

گنگا دھر کی مسرّتوں پر جیسے سو من کا ہتھوڑا پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے جلدی ہے چودھری۔''

کوچوان نے بے دلی سے کہا۔ ''میرا کیا اعتراض ہے، سالم تانگے کا کرایہ دو ابھی چلتا ہوں۔''

''سالم کرایہ؟ کتنا ایک؟'' گنگا دھر نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

''چار روپے اور کتنا؟''

گنگا دھر کوچوان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ بولا۔ ''مگر چودھری، پچھلی بار جب میں گھر گیا تھا تو بارہ آنے ہی دئے تھے۔''

کوچوان نے اپنا سر پھر باہر نکالا اور کہا۔ ''کب کی باتیں کر رہے ہو، آج تین مہینے سے کرایہ چڑھا ہوا ہے۔''

''یہ کیوں؟''

''دانے جو مہنگے ہو گئے ہیں، بھوسہ نہیں ملتا۔ باہر سے چنے نہیں آتے، زمیندار لوگ گھاس نہیں بیچتے۔ لالچ نے سب کو بے ایمان بنا دیا ہے۔''

گنگا دھر کا جوش و خروش آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس نے دس نمبر کا سگریٹ نکالا اور وہیں سڑک پر پینے لگا۔

تمباکو کی خوشبو سے متاثر ہو کر نوجوان نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''ایک مجھے بھی دو بھائی، آج سردی بہت زیادہ ہے، کہتے ہیں کہیں سرد لہریں آ گئی ہیں، مگر تم فکر نہ کرو، سواریاں آئیں گی تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا لال پور پہنچ جائے گا۔''

اس اطمینان سے گنگا دھر کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے ایک سگریٹ کوچوان کی طرف بڑھایا۔ کوچوان نے کہا۔ ''کھڑے کھڑے کیوں اپنے آپ کو تھکا رہے ہو، تانگے پر بیٹھ جاؤ، سردی سے اکڑ جاؤ گے، یہ لو کانگڑی، ہاتھ سینک لو......''

گنگا دھر نے پہلے اپنی گٹھڑیاں تانگے پر رکھ دیں، پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ اس کے بوجھ سے تانگہ ذرا پچھلی طرف کو جھک گیا جس سے اونگھتے ہوئے گھوڑے میں بھی بیداری سی آ گئی۔

''بڑی دیر ہو رہی ہے، اب نو بج رہے ہیں۔'' گنگا دھر نے تھوڑی دیر کے بعد کہا
''اتنی کیا جلدی ہے؟'' کوچوان نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

''شیوراتری پر چار مہینے کے بعد گھر جا رہا ہوں۔'' گنگا دھر نے کہا۔

''اچھا اچھا سمجھ گیا، پر شادی ہوئی ہے تمہاری؟'' کوچوان نے مڑ کر پوچھا۔

''ہاں ہاں ایک بچہ بھی ہے، سال بھر کا......''

''چار مہینے سے گھر والی کو نہیں دیکھا؟'' کوچوان نے پوچھا۔

''چھٹی ہی نہیں ملی، دیکھتا کیسے؟''

''واللہ تم پنڈت لوگ گہرے اور صابر ہوتے ہو۔ مسلمان کی شادی ہوئی ہو اور وہ چار مہینے سے گھر والی کو نہ دیکھے، یہ ناممکن ہے۔ وہ تو اس کے دامن ہی سے نہیں نکلے گا اور اسی لئے مسلمان طبقہ تباہ حال ہے۔''

گنگا دھر ہنسنے لگا، بولا۔ ''ملازمت میں یہ نخرے نہیں چلتے، چودھری ورنہ گھر کسے پیارا نہیں!''

''یہ تو ہے ہی، ملازمت کی وجہ سے مجھے بھی منہ اندھیرے اڈے میں آنا پڑا۔ ورنہ کون ان سردیوں میں اپنا گھر چھوڑ کر باہر نکلے۔'' کوچوان نے کہا۔

''یہ تانگہ تمہارا نہیں؟'' گنگا دھر نے پوچھا۔

''ایسی قسمت کہاں، اپنا تانگہ ہوتا تو بارہ بجے سے پہلے کبھی گھوڑا نہ جوتتا۔''

''کس کا ہے؟'' گنگا دھر نے پھر پوچھا۔

''ایک نانوائی کا ہے جو مرغ کی بانگ سنتے ہی میرے سر پر لاٹھی لے کر سوار ہو جاتا ہے۔ پیسہ اتنا ہے جتنا دُنیا میں جھوٹ۔ مگر پھر بھی لالچ ہے کہ اسی کا تانگہ سب سے پہلا نمبر حاصل کرے۔ اب بتاؤ کہ آخر زمانہ ہے کہ نہیں؟''

''جس کا آدمی کھالے اسے برا بھلا نہیں کہنا چاہئے۔'' گنگا دھر کا برتر اخلاق جاگ اٹھا۔

کوچوان چمک اٹھا۔ ''اس کا کیا کھاتا ہوں، اپنی محنت کرتا ہوں اور اسے بھی کھلاتا ہوں۔ وہ حرامی کس کو کھلانے والا ہے۔

''کیا تنخواہ دیتا ہے؟'' گنگا دھر نے دوسرا سوال کیا۔

''تنخواہ کیا دیتا ہے چھ روپے اور روٹی کپڑا۔'' کوچوان نے غصے میں کہا

''کچھ اوپر سے بھی کماتے ہو؟''

''اور نہیں تو کیا چھ روپے پر ہی زندہ رہ سکوں گا' اس طوفان میں۔نوجوان نے کہا۔''

''اسے تمہاری بے ایمانی پر شک نہیں ہوتا......؟'' گنگا دھر نے حیران ہو کر پوچھا ''شک ہو گا بھی تو مجھے کیا کرے گا' میری تنخواہ بڑھائے' میں بے ایمانی نہیں کروں گا۔ ''کوچوان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''نانوائی کی دکان بھی کرتا ہے؟''

''اور کیا کہہ رہا ہوں' تیس چالیس' روز وہاں سے کماتا ہے' آٹھ دس روپیہ میں کما کر دیتا ہوں۔ پھر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔عیال بھی کیا ہے' ایک بیوی اور ایک بیٹی اور پھر تم جانتے ہو' یہ لوگ آج کل آٹے میں کیا کچھ ملاتے ہیں۔''

گنگا دھر نے فلسفی کی طرح کہا۔''ساری دنیا بے ایمان ہو گئی ہے چودھری اب یہاں مسکینوں کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔''

کوچوان یہ سن کر تڑپ اٹھا۔اس نے ٹوپی ایک طرف کو پھینک دی اور کہا ''ہم مسکین ضرور ہیں مگر دولت کون پیدا کرتا ہے' اناج کون اگاتا ہے' ریشم اور پشمینہ کون بنتا ہے اس پر بھی ہم بھوکوں مریں' گالیاں کھائیں سردیوں میں اکڑ جائیں۔ اب نہیں چلے گا پنڈت' تم بزدل ہو' نوکریوں کے لئے مرتے ہو' مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ہمیں پیٹ بھر کر روٹی ملنی چاہیئے۔''

گنگا دھر نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔''ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔حکومت پکڑ کر لے جائے گی۔''

اتنے میں لال پور کی سواریاں آ گئیں۔گنگا دھر اور کوچوان اپنی گفتگو بھول گئے اور

تانگہ لال پور کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں گنگا دھر سوچتا رہا' ان ننگے اور بھوکے مسلمانوں میں کتنی بیداری آگئی ہے۔ یہ بلاخوف کتنی زہریلی باتیں کرتے ہیں' بدن پر کپڑا نہیں مگر حوصلے دیکھو' اپنے مالکوں کو کیا کچھ سناتے ہیں۔

گنگا دھر کے آنے سے گھر میں خوشی کے چشمے ابل پڑے۔ آفتاب رام دکان بڑھا کر آ گیا۔ واسدیو نمبردار کے گھر میں ایک کسان کو عدالت میں مکر جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے گنگا دھر کے آنے کا خبر سنی تو سارا کام چھوڑ کر آ گیا۔ بھاوجیں خیریت پوچھتی رہیں' بیوی چوکے میں چھپ چھپ کر اسے دیکھتی رہی۔ بچے اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ گنگا دھر کبھی واسدیو کے بچے کو چومتا اور کبھی آفتاب رام کی بیٹی کو' مگر اپنے سال بھر کے بچے کی طرف اس نے نگاہ تک نہ اٹھائی بچہ حیران تھا کہ یہ کون ہے جو اوروں کو چومتا ہے مگر میری طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتا' ایک بار وہ گھٹنوں کے بل اٹھا اور گنگا دھر سے لپٹ گیا۔ گنگا دھر جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا اور واسدیو نے گرج کر کہا' اسے پرے ہٹا دو' بے حیا کہیں کی' اپنے باپ کو پہچانتا ہے' پورا کلجگ آ گیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سماوار ابلنے لگا' پھر باتیں ہونے لگیں۔ شہر کی' لوگوں کی' حکومت کی ، برف اور سرد ہواؤں کی' غرض کوئی مسئلہ موضوع گفتگو بننے سے نہ رہا۔

پھر واسدیو کے اشارے پر آفتاب رام نے گٹھریوں کے منہ کھول دئے' سازو سامان دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔ بچے مرغابیاں دیکھ کر پہلے تو سہمے' پھر انہیں چومنے لگے۔

عورتیں وانکہ پن' پیرہن اور دوسری چیزیں دیکھ کر ناچ اٹھیں' معاً واسدیو کی نظر صابون کی ٹکیوں پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

گنگا دھر نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بھابی کے لئے لایا ہوں۔"

بھابی کے لئے خوشبودار صابون......واسدیو کے لہجے میں غصہ تھا' آگ تھی' گنگا

دھر سب کچھ تاڑ گیا اور واسدیو نے کہا۔ ''ابھی اس گھر میں ایشور کی مہربانی سے کلجگ نہیں آیا تھا۔ ہاں اگر تم شہر سے لئے آؤ، تو تعجب نہیں۔''

سارے کمرے میں ایک عجیب خوف سا چھا گیا۔ گنگا دھر سر جھکائے بیٹھا رہا عورتیں چوکے میں حیران رہ گئیں اور واسدیو نے پھر کہا۔ ''انہیں دکان پر رکھ دو، ہندو عورت کا زیور مٹی ہے، صابون کنجروں کے گھروں میں ہوتا ہے۔ خبردار آئندہ ایسی حرکت کی، آخر دھرم بھی کوئی چیز ہے۔''

اتنے میں نمبردار وہیں آ گیا، بولا۔ ''اب یہی بات پکّی ہو گئی واسدیو...... عظیم بٹ عدالت میں مکر جائے۔''

واسدیو نے کہا۔ ''اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں، ہاں اگر کاغذ ہوتا تو مکرنا مشکل تھا۔ نمبردار نے ہنس کر کہا۔ ''عظیم بٹ گھبراتا ہے، کہتا ہے، جھوٹ کیسے بولوں گا۔'' ''خیر اب میں نے اسے دلاسہ دیا ہے۔''

واسدیو نے ہنس کر کہا۔ ''ان بے غیرتوں کا کیا ہے۔ ذرا سی بات پر گھبراتے ہیں، اس کے بعد نمبردار چلا گیا۔ واسدیو نے اپنے آپ سے کہا۔ مسلمان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ارادے کا کچا ہوتا ہے۔ نہ دُنیا سازی جانتا ہے نہ دُنیا داری۔''

رات آ گئی اور سب کھا پی کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ گنگا دھر ساری رات اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہا۔ اس خیال سے کہ گھر میں کسی کو ان کی بیداری کا علم نہ ہو، انہوں نے سرِ شام ہی مٹی کا دیا بجھا دیا۔

بیوی نے بے شمار شکائتیں کیں، گلے کئے، آنسو بہائے اور گنگا دھر نے شرم و حیا اخلاق اور تابع داری کے واسطے دے دے کر اسے مطمئن کر دیا اور جب صبح ہو گئی تو اس نے بیوی کے ہاتھ میں دو روپے کا ایک نیا گلابی نوٹ رکھ دیا، بیوی کو اعتبار نہ آیا کہ اسے بیک

وقت دو روپے مل رہے ہیں۔

گنگا دھر نے کہا۔ رکھ لو، کام آئے گا۔ مگر اسے ہوشیاری سے نبھانا' کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو' ورنہ آفت آ جائے گی اور سب سنیں گے کہ بیوی کو پیسے بھی دینے لگا ہے۔''

اس کے بعد اس نے اندر کی جیب سے ٹین کا جھنجھنا نکالا۔ بیوی نے پوچھا۔'' یہ کیا ہے؟''

'' ننھے کے لئے لایا ہوں' مگر کوئی اسے نہ دیکھے۔'' گنگا دھر نے بڑے رازدارانہ لہجے میں تنبیہ کی۔''

دو روپے کے نوٹ اور ٹین کے جھنجھنے پر اس کی بیوی کو یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات ایک خواب اور رقص کی دُھن پر ناچ رہی ہے اور ہر طرف سے گھنگھرو بج رہے ہیں' قہقہے ہی قہقہے پھوٹ رہے ہیں' خواب ہی خواب بکھر رہے ہیں۔

لیکن اسی صبح قیامت سی آ گئی۔ اس کا ننھا بچہ ماں سے آنکھ بچا کر جھنجھنا لے کر نیچے آ گیا۔ واسدیو اور آفتاب رام کے بچے جھنجھنا دیکھ کر مچل اٹھے' رونے لگے' ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کی مائیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں اور چھاتیاں پیٹنے لگیں۔ واسدیو حقہ پی رہا تھا۔ اس نے جھنجھنا دیکھا تو پوچھا۔'' یہ کیا فتنہ ہے؟''

گنگا دھر بڑے تابع دارنہ انداز میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اُسے بیوی کی حماقت پر سخت غصہ آ رہا تھا' کم بخت کو چھپانے کا بھی سلیقہ نہیں۔ واسدیو سب کچھ سمجھ گیا وہ حقہ بھی پیتا رہا اور زہر بھرے فقرے بھی کہتا رہا۔ اب اس گھر میں اتفاق نہیں ہوگا۔ گھر کے لونڈے نے شہر کی نوکری کیا کی۔ گھر میں فتنے اور فساد کا بیج بو دیا۔ یہ بے حیائی کی حد ہوئی۔ ہمارے ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کو کھلونے نہیں دئے اوپر جا کر دئے۔ رام جانے اور کیا کچھ دیا ہوگا......''

گنگادھر کے پیٹ کا پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک پانی ہی پانی ہو گیا اور اندر ہی اندر سے اپنی رونوں کا گوشت نوچنے لگا۔

تین دن تک کسی نے اس سے بات تک نہیں کی جیسے وہ اچھوت تھا۔ اور جب شیوارتری گذر گئی تو دوسرے ہی دن صبح وہ شہر کی طرف چل دیا۔

ساڑھے تین آنے کے جھنجھنے نے اس کی زندگی میں مستقل طور پر زہر گھول دیا تھا۔ اس کا برترا اخلاق گرا دیا تھا اور اسے سارے گھر کا دشمن بنا دیا تھا۔



چوَنی

اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جب بیٹے نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ''انّا۔ چوَنی کھو گئی''۔ یہ پہلا واقعہ ہے۔ جب انّا نے اپنی عمر میں ایسی منحوس خبر سنی اور وہ بھی اس وقت جب اس کا خاوند پچھلے سال ہی تین بچے چھوڑ کر مر گیا۔ اور اس کے گھر میں شب و روز، خاک اڑنے لگی۔

اس نے چھاتی پیٹ کر پوچھا۔ ''............کہاں؟''

چھوٹے جوآد نے اور رونی صورت بنا کر جواب دیا۔ ''وہاں قبرستان کے پاس!

انا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''میرے اللہ اب تو انتہا ہو گئی''۔

جواد کے دو بھائی ماں کی بے قراری کو بھانپ کر سہم گئے۔ ان کی آنکھو میں بھی آنسو آ گئے۔ اور ماں نے کہا۔ ''مجھے دکھا دو وہ جگہ!''

جواد نے کہا۔ ''میں نے بہت تلاش کی۔ نہ ملی۔ وہاں محلے کے کئی لڑکے کھیلتے تھے۔ جانے کون اُٹھا کر لے گیا۔'' ماں کی ممتا غریبی اور افلاس کے پردوں میں چھپ گئی۔ اس نے اس زور کا طمانچہ جواد کے منہ پر مارا۔ کہ اسکی نکسیر پھوٹی لٹھے کا میلا کُرتہ خون سے بھر گیا۔ اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

پیچھے سہمی ہوئی دو ننھی جانیں دب گئیں۔ اور جواد کے ساتھ وہ بھی رونے لگیں۔

آج کئی دنوں کے بعد انّا کی شبانہ محنت ٹھکانے لگی تھی۔ اور ابھی تک اسکی انگلیوں میں چرخ کے دستے کا نشان تھا۔ چونی کے ساتھ اسکی کتنی ہی امیدیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ستو۔ سرسوں کا میٹھا تیل۔ بمبئی کی چائے۔ نمک۔ اور کچا پشمینہ یہ سارا سامان چونی کے سولہ پیسوں کے عوض لانا تھا۔

اس نے پھر گرج کر لیکن ناامیدی کے لہجے میں کہا۔ ''مجھے دکھادو وہ جگہ میں ڈھونڈوگی۔''

روتا ہوا جواد آگے آگے چلا۔ اور ناامید ماں پیچھے پیچھے۔

کتنی ہی دیر اس نے اجڑے قبرستان کی خاک چھانی۔ لیکن چونی نہ ملنی تھی نہ ملی۔ اسکی آنکھوں کی ساری بصارت قبرستان کے ذروں پر خرچ ہوگئی اور داغدار انگلیوں کی رہی سہی طاقت خاک کے ڈھیروں کو الٹنے پلٹنے پر اندھیرا چھا جانے تک وہ تلاش کرتی رہی۔ جب مایوس ہوگئی۔ تو اپنی قسمت کو روتی ہوئی اور جواد کو دھکے پر دھکا دیتی ہوئی گھر لوٹی۔ راستے میں ایک بوڑھی عورت نے پوچھا۔ ''خیر ہے انا۔ چھوکرا کیوں رو رہا ہے۔''؟۔

انّا آگے ہی آگ بگولا تھی۔ بڑھیا کی مزاج پرسی نے اس کا رہا سہا بھی جلا دیا۔ بے پروائی سے بولی۔ ''خیر ہے!''

لیکن بوڑھوں کے دل میں جو شفقت اور محبت کی تری ہوتی ہے۔ وہ جوان دلوں میں کہاں۔؟

بڑھیا نے قدم روک کر پوچھا۔ ''خیر ہے۔ تو روتا کیوں ہے؟'' انّا نے ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''سودا خریدنے گیا تھا۔ راستے میں چونی کھودی''۔

بڑھیا نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو اسی بات پر اسے مارا ہے۔ بے چارے کی نکسیر

پھوٹ گئی ہے۔ لعنت ہے تم پر۔ خدا۔ سے تندرستی مانگو۔ چونی کیا۔ اشرفیوں سے مالا مال کر دے گا''۔

انا اپنی قسمت سے واقف تھی۔ جل بھن کر بولی۔ ''مالا مال کرے گا اب دوسری دنیا میں۔'' انا کی اس مایوس حالت کو دیکھ کر بڑھیا کا دل موم بن کر پگھل گیا۔ اس نے پیرہن کی جیب سے چونی نکال کر ان کو دی اور کہا۔ ''یہ لو۔ لیکن لڑکے کو مارومت۔ بے چارہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔ اور ہاں سر پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ خون جم جائیگا''۔

انا کی خودداری جوش میں آ گئی۔ اس نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ''میں بھکارن نہیں۔ مزدوری کا ساگ بھتہ کھاتی ہوں۔ لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی''۔

بُڑھیا نے مسکرا کر کہا۔ ''اوہ۔ بڑی پارسا بنی پھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں۔ جب چونی ملے۔ تو لوٹا دینا۔ خیرات کیا ہے۔ اُدھار ہے''۔

چونی دیکھ کر جواد کے سینے کے اندر ننھا سا دل مینڈک کی طرح اچھلنے لگا۔ اور انا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر چونی لے لی۔ لیکن اسے محسوس ہوا۔ اس چونی اور کھوئی ہوئی چونی میں فرق ہے۔ ورنہ چونی مل کر جو تسکین اسے ہونی چاہئے تھی۔ وہ نہ ہوئی۔ سوچتی رہی۔ وہ چونی کتنی خوبصورت تھی خالص چاندی کی۔ گول۔ اُبھرے ہوئے ہندسے والی۔ اور بڑھیا کی چونی ہلکی۔ میلی۔ بدصورت۔ کون جانے کھوٹی نہ ہو''۔

رات کو اُس نے نہ خود کچھ کھایا۔ نہ بچوں کو کچھ کھلایا۔ وہاں تھا ہی کیا......؟ چھوٹے بچوں کو روتے روتے نیند آ گئی تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کو گود میں سو گئے تھے۔ جوآد کی ناک سے اب تک خون بہ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے اس کا دانت سے دانت بجتا تھا۔

۲

دوسرے دن پو پھٹتے ہی انا پھر قبرستان کی طرف گئی۔ کافی دیر تلاش کرنے کے

باوجود بھی جب چونی نہ ملی۔ تو لوٹ آئی۔ گھر میں جواد بخار سے کراہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ شعلے کی طرح سرخ تھا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''انا!''

انا اس کے پاس آگئی۔ پھٹی ہوئی چادر اُٹھا کر اس نے دیکھا۔ جواد تپ رہا ہے۔ پسلیوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو جیسے اندر تنور جل رہا ہو۔

انا نے پوچھا۔ ''درد ہے کیا۔؟

جواد نے کہا۔ ''ہاں اندر سے جل رہا ہوں۔ اور پسلیوں میں کانٹے چبھ رہے ہیں''۔

انا نے کہا۔ ''کوئی پروانہیں۔ ابھی گرم پانی کی ایک پیالی سے ٹھیک ہو جاؤ گے۔ چونی نہ کھوئی ہوتی۔ سردی بھی نہ لگتی۔ مار بھی نہ پڑتی۔ میں نہ کہتی تھی۔ راہ چلتے ادھر ادھر مت دیکھا کرو۔ لیکن تم میری بات مانتے ہی کب تھے۔''

جواد نے ناک کے سرے سے منجمد خون کو اپنی انگلی سے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''چونی مل گئی؟''

انا نے کہا۔ ''نہیں۔ جائے گی کہیں نہیں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے!'' گرم پانی پلا پلا کر نہ جواد کا بخار اترا اور نہ اس کے اضطراب میں کمی ہوئی۔ انا اس کی حالت دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگی۔ لیکن خالی ہاتھوں کیا کرتی۔ محلے میں پرانی وضع کا ایک حکیم تھا۔ وہ بیمار کو دیکھتا تو انا اسے گھر میں بلا کر کیا دیتی۔ دوا دارو کہاں سے خریدتی۔؟

تیسرے دن جواد کو گود میں اٹھا کر حکیم کے پاس لے گئی۔ حکیم نے سیخ پا ہو کر کہا۔ ''ایسے بیمار کو تم یہاں لائی کیسے؟ نہیں دیکھتی دو سو سے اوپر بخار ہوگا۔ اگر راستے میں سردی لگ جائے تو۔''

اناّ نے کوئی جواب نہ دیا۔ حکیم نے اسکی نبض دیکھی ۔ زبان کا ملاحظہ کیا اور پھر کاغذ پر نسخہ لکھکر دیا۔ اور کہا۔" بیمار کو ڈھک کر لے جاؤ۔ اور گھر کمرے میں رکھو۔ خبردار! سردی نہ لگنے پائے ۔ خدا کو منظور ہوگا۔ اس جوشاندہ سے دو دن ہی میں اُٹھ بیٹھے گا۔ دراصل اسے نزلہ ہے۔

اناّ کی ہمت بندھ گئی۔ وہ بیمار کو لے کر گھر آئی۔ تو اسے نسخہ کی فکر ہوئی۔ پنساری اتنا بدمزاج تھا۔ کہ اُس سے ادھار مانگنے کی اس کی جرأت نہ ہوئی۔

ناچار اسے خاوند کے تعویذ کا خیال آیا۔ جو اس کے خاوند نے اپنے شادی میں ہاتھی پور کی چاندی کا بنوایا تھا۔ اس پر ایسے نقش ونگار تھے۔ کہ آج تمام سنار دیکھ کر واہ واہ کہہ اُٹھتے تھے۔ مٹی کی ہانڈی سے جب اس تعویذ کو نکالا۔ تو اسے گذرا ہوا زمانہ یاد آگیا۔ وہ شام یاد آگئی۔ جب اسکے خاوند نے اسے پہن کر مسجد میں نماز پڑھی تھی ۔ اور گھر میں اناّ نے ساری رات پیر صاحب کے کہنے کے مطابق چراغ جلا رکھا تھا۔

بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس نے کئی بار خاوند کی آخری نشانی کو دیکھا اور پھر بازار چلی گئی۔

تعویز بیچ کر اور جوشاندہ پلا کر بھی جواد کا بخار نہ ٹوٹا۔ روز بروز اسکی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ چھٹے دن اسے سدھ بدھ نہ رہی اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ کبھی کہنے لگا۔" اناّ مل گئی چونی ؟"

اس وقت اناّ کے دل پر آرے چلتے اور دل کے کسی چھپے کونے میں افلاس اور مامتا کی جنگ چھڑ جاتی ۔ کبھی افلاس مامتا پر غالب آتا۔ اور کبھی مامتا افلاس پر چھا جاتی ۔ وہ رات جواد نے بہت اضطراب میں بسر کی ہر بار آنکھیں کھول کر اور ان کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھتا۔" اناّ مل گئی چونی ؟"

اور انا آنسوؤں پہ پورے زور سے قابو پا کر کہتی۔ ''مل گئی میرے لال۔''

اسی دن صبح جب مسجد سے موذن نے بانگ دی۔ جواد نے زور سے کہا۔ ''انا''۔

اور پھر ابدی نیند سو گیا۔ مؤذن کی بانگ نے ننھے جوادؔ کی روح کو خدا کی دعوت دی۔!''

انا دیوانی سی ہو گئی۔ مامتا کے سمندر میں طوفان آ گیا۔ جس میں اسے دنیا کی دولت۔ شہرت۔ اور عزت گھاس کے تنکوں کی طرح بہتی دکھائی دی۔

خاوند کی دو نشانیاں ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل گئیں۔ انگلیوں کے داغ ابھر گئے۔ اور دل میں ایک نا قابل بیان درد اٹھا۔ اس کا گھر اب تاریک سے تاریک تر ہو گیا۔ آنکھوں کی بصارت قبرستان کی خاک کیساتھ مل گئی۔ اور نا امیدی کا کاجل ان سے بہنے لگا۔

۳

ہر جمعہ کو پچھلے پہر انا قبرستان جاتی۔ خاوند اور بیٹے کی قبروں کے درمیان بیٹھ کر روتی۔ اُن قبروں کی خاک آنکھوں اور گلے پر ملتی۔ اسے اب بھی محسوس ہوتا۔ جیسے چھوٹی قبر کے اندر سے جواد زور زور سے پوچھ رہا ہے۔ ''انا۔ چونی مل گئی''؟ اور نہ آس پاس بکھری ہوئی خاک اسکی قسمت پر ہنستی اور ادھر ادھر اڑتی ہوئی اس سے پوچھتی۔ ''مل گئی چونی؟''

انا آنسو پونچھ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوتی۔ چلتے چلتے اسکی نظریں اسی جگہ پڑی جہاں چونی کھو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے تلاش میں آوارہ بھٹکتی۔ صرف اس امید پر کہ شاید مل جائے۔ شاید یہیں کہیں پڑی ملے۔

اور ایک جمعہ کو سچ مچ اسے قبرستان میں چونی ملی۔ جس پر مٹی کی تہہ جم گئی تھی۔ وہ اسے پا کر دیوانی ہو گئی۔ اس نے چونی پہچانی۔ یہ وہی تھی۔ جو کچھ عرصہ پہلے جوادؔ سے کھو گئی تھی۔ وہ دوڑ کر جوادؔ کی قبر پر گئی۔ اور اپنا منہ قبر سے لگا کر بولی۔ ''جوادؔ۔ چونی مل گئی۔ میرے لال اب نکلو باہر''۔ لیکن وہاں کون تھا۔ جو جواب دیتا۔ البتہ اسے محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے

اندر سے لمبی سانس لی۔اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

۴

کئی سال بیت گئے۔انّا کے گھر کی حالت دگرگوں ہوگئی۔اس کی دونوں لڑکے جوان ہوگئے تھے۔ایک کی شادی بھی ہوچکی تھی۔گھر میں فارغ البالی اور آسودہ حالی کے دن آگئے تھے۔دونوں لڑکوں نے گھر ہی میں قالین بافی کا کارخانہ کھولا تھا۔جس میں ایک درجن کے قریب محلے کے لڑکے کام کرتے تھے۔انا بصارت کھوچکی تھی۔ایک صاف اور پاک کمرے کے کونے میں وہ نمدے پر بیٹھی رہتی۔بہو گھر کا کام کاج چلاتی۔شام کو کارخانہ بند ہوتا۔تو دونوں لڑکے ماں کے قدموں میں آکر بیٹھتے۔رسول کریمؐ کی صفات ان کے کارنامے اور اسلام کی برکتوں کے قصے سناتے۔کارخانے میں جنگ کے متعلق جو کچھ سنتے۔ وہ ماں کو بھی سناتے۔اور انّا راج رانی کی طرح گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھی سنتی۔ایک دن شام کو دونوں لڑکے ماں کے پاس بیٹھے تھے۔کارخانے کا ایک شاگرد روتا روتا آیا۔انا کے کنوارے بیٹے نے پوچھا۔''کیا ہے سلطانا؟'' روکیوں رہے ہو؟''

شاگرد کچھ نہ بول سکا۔روتے روتے اسکی ہچکی بندھ گئی۔

انّا کے بیٹے نے پھر پوچھا۔''ارے کیا ہوا؟ کہو بھی؟''

شاگرد نے روتے روتے کہا۔''جو چونی آپ نے سودا خریدنے کے لئے دی تھی وہ کھوگئی''۔دونوں بھائیوں نے زور سے ہنس دیا۔دوسرے کمرے میں بڑے بھائی کی بیوی یہ سن رہی تھی۔وہ بھی اپنی ہنسی کو نہ روک سکی۔

تب چھوٹے بھائی نے کہا۔''تو کیا ہوا۔کھوگئی تمہاری بلا سے۔روتے کیوں ہو ؟'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے دوسری چونی نکالی۔اور اسکی طرح پھینکتے ہوئے کہا۔''جاؤ۔ اب سنبھال کرلے جانا''۔

پھر بڑے بھائی سے کہا۔ ’’بچوں کی فطرت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ ذرا سی بات پر کس قدر رو دیتے ہیں‘‘۔

سامنے اناّ منہ کھول کر یہ سن رہی تھی۔ اسکی نابیانہ آنکھوں سے آنسو پھوٹ گئے تھے۔ جانے اسے آج سے کتنے سال پہلے کا دلگداز واقعہ یاد آ گیا تھا۔



راجو کی ڈولی

سورج ڈوب چکا تھا۔ ناٹک کے پردوں کی طرح گاؤں کے چھوٹے سے سٹیج پر شام دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ جس سے درخت۔ پہاڑ ندیاں اور جھرنے سب چھپے جارہے تھے۔

رمضان نے آہستہ سے آنگن کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کھانسنے کی آواز پہچانتے ہی اُس کی ننھی پوتی نے اُچھل کر کہا ''لالہ''

رمضان نے چپ چاپ دروازہ بند کیا۔ بولا کچھ بھی نہیں، ننھی کی آواز سن کر رمضان کی بیوی ڈوڑتی ''ڈوڑتی آئی۔ آنگن میں پہنچ کر بولی۔ ''کیا ہوا آج''؟

رمضان نے گلے سے ڈوپٹہ اُتارتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''خدا اچھا ہی کریگا شاید۔ فیصلہ کل پر رہا''؟ بیوی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ اور تاروں بھرے آسمان کی طرف نظریں جما کر بولی۔ ''یا خدا!''

رمضان اوپر چلا گیا۔ تو ننھی پوتی نے پاس آکر پوچھا۔ ''لالہ ڈولی نہیں لائے''؟ جوان بیٹے کے مرنے کے بعد جس چیز کو دیکھ دیکھ کر رمضان اور اسکی بیوی جیتے تھے وہ ان کے بیٹے کی نشانی یہی ننھی راجو تھی۔

رمضان کا دل اداس تھا۔ پھر بھی ضبط کر کے بولا۔ اگر لائی ہو۔ تو کیا دوگی ہمیں

''؟ راجو نے ندی کے کنارے سے نہ جانے کب ایک سفید اور گول کنکر اٹھایا تھا جسے وہ پیر ہن کی جیب میں سنبھال کر رکھتی تھی۔ اسی کو نکالتے ہوئے بولی'' یہ''

رمضان بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بڑے صندوق کی اوٹ میں رسوئی کے پاس راجو کی بیوہ ماں کھڑی تھی۔ اپنی بیٹی کا تحفہ دیکھ کر وہ بھی مسکرائی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اور رمضان کی ہنسی میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ ماں کی مسکراہٹ میں مامتا چھپی تھی اور دادا کی ہنسی میں درد!

رمضان تھوڑی دیر کے لئے سارا غم بھول گیا۔ بولا'' اچھا بیٹا۔ یہی سہی!'' راجو نے کہا'' لاؤ ڈولی'' رمضان نے کہا'' ابھی نہیں۔ کل صبح۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ ڈولی میں بیٹھے گا کون؟''

راجو نے معصوم انداز میں کہا'' میری گڑیا'' رمضان نے کہا'' اچھی بات ہے۔ جب صبح ہوگی۔ تو ڈولی آئے گی۔''

اس بات سے راجو کا ننھا سا دل جیسے ایک چٹان دب گیا۔ وہ خاموش ہوگئی اس کی معصوم آنکھوں سے معلوم ہونے لگا۔ جیسے کسی نے اس کا سارا چین چھین لیا۔

اور اسی رات۔ رمضان کی بیوی اور بہو خوش تھیں۔ انہیں یقین تھا۔ مالک صاف بچ جائے گا۔ لیکن دوسری طرف رمضان اور راجو اداس تھے۔ راجو اس لئے کہ اسکی ڈولی نہ آئی تھی۔ اور رمضان اس لئے کہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ رہا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد اس نے مٹی کا دیا سامنے لا کر رکھا۔ اور قرآن شریف پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اس کا جسم ایک نامعلوم خوشی اور مسرت سے جھوم رہا تھا۔ جب قرآن شریف پڑھ چکا۔ تو آدھی رات ہوگئی تھی۔ بیوی بہو اور راجو سو گئے تھے!۔

باہر چاندنی گیہوں کے لہلہاتے کھیتوں میں دیوانی ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں

کہیں بادل کے ٹکڑے آدمیت سے خالی لفنگوں کی طرح قدرت کی دوشیزہ کو دیکھ کر ایک ہی جگہ جم سے گئے تھے!

رمضان نے دیا بجھایا دیا۔ اور آہستہ سے نیچے اُترا۔ آج نہ جانے کیوں اسے آباد اجداد کا مکان اور باغیچہ دل کھول کر دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ آلوچہ اور خوبانی کے خوبصورت درخت جو اس کے جواں بیٹے نے باغیچے میں لگائے تھے۔ اس چاندنی میں پھولوں سے سجے شہزادوں کی طرح کھڑے تھے۔ اور اپنے مالک کو دیکھ کر ان کی پنکھڑیوں سے مسکراہٹیں چھن چھن کر فضا میں پھیل رہی تھیں۔ لیکن مالک کی آنکھوں میں حسرت تھی۔ ایسی حسرت جسے چاند کی نورانی کرنیں بھی نہ چھپا سکیں۔

ایک ایک درخت گھوم کر رمضان نے دیکھا۔ دیکھا اور چوما، چوما اور رو دیا۔

۲

رمضان گاؤں کا نائی تھا۔ بال کاٹنے کے علاوہ دوا دارو کا کام بھی کرتا تھا۔ لیکن جس فن میں اسے خاص مہارت تھی وہ دانت نکالنے کا فن تھا۔ دور دور سے مریض آکر اس کے قدم چومتے۔ لوگ کہتے۔ ''رمضان کے ہاتھ میں جو شفا ہے۔ وہ لنڈن ڈنٹس ڈاکٹروں کی قسمت میں کہاں؟ دن بھر شہر میں دکانوں پر بیٹھ کر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔ اور رمضان کو دیکھو۔ دن بھر جمور لئے رہتا ہے۔ کراہتے ہوئے آنے والے بیمار مسکرا مسکرا کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رمضان کسی سے کچھ مانگتا نہیں۔ جو جسکا جی چاہتا ہے آگے رکھ دیتا ہے!

لیکن پچھلے مہینے جو نہ ہونا تھا۔ وہی ہوا۔ رمضان نے ایک مریض کا دانت نکالا۔ تو جیسے اس کی شہ رگ ٹوٹ گئی۔ خون کے فوارے چھوٹ گئے۔ مریض بے ہوش ہو گیا۔

رمضان اٹی سٹی بھول گیا۔ خون کسی طرح نہ رک سکا۔ مریض کے وارث برہم

ہو گئے۔ رمضان کو پکڑ کر بولے۔ ''قصائی۔ خونی!''
آج تک جس رمضان کو پوجا جاتا تھا۔ آج اُسی کو داڑھی سے کھینچ کر گھسیٹا جا رہا تھا۔ کچھ ان میں ایسے جوشیلے جوان تھے۔ جو بھاگ کر پولیس میں رپٹ لکھوانے گئے۔ بیمار کو چارپائی پر اٹھا کر لے گئے۔ تو پولیس آ گئی۔ رمضان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بہو اور اسکی بیوی چھاتیاں پیٹتی رہ گئیں۔ اور پولیس رمضان کو لے گئی۔ کچھ دنوں کے بعد تحقیقات ہونے لگی۔ پولیس نے رمضان کا چالان ضرب شدید میں کر دیا۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''نا تجربہ کار نائی مدت سے بھولے بھالے دیہاتیوں پر چھریاں چلا رہا ہے''؟

۳

عدالت میں رمضان نے صاف صاف کہہ دیا۔ جو ہوا تھا۔ اس سے عدالت کو معاملہ سمجھنے میں دقت نہ آئی۔
رمضان کو یقین تھا۔ کہ جو کام پولیس میں روپے کر سکتے تھے۔ وہ عدالت میں محض سچائی کا اظہار کریگا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا۔ قانون کی باریک نظروں میں جرم جرم ہی ہے۔ اور سچائی سچائی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اور اپنا اپنا مرتبہ رکھتے ہیں۔ نہ سچائی کو ظاہر کرنے سے مجرم بچ سکتا ہے اور نہ مجرم کے انکار سے صداقت چھپ سکتی ہے۔
چالان ہونے کے بعد جب رمضان پہلی پیشی پر حاضر ہونے کے لئے گھر سے نکلا تھا تو دور تک اس کی بیوی اور بہو دیکھتی رہیں۔ اور راجو۔ وہ کہتی رہی۔ لالہ آج مٹی کی ڈولی لانا''۔
کبھی کبھی راستے میں بھی رمضان کو ایک طرف سے ماتا اور محبت کھینچ رہی تھی۔ اور دوسری طرف قانون!۔ اور آج مقدمہ کی کاروائی ختم ہو گئی تھی۔ کل کا دن فیصلہ سنانے کے

لئے مقرر تھا۔

دوسرے دن صبح جب وہ گھر سے چلا۔ تو دور پہنچ کر اس نے حسرت بھری نظروں سے اپنے مکان اور باغیچے کو دیکھا۔

بیوی، بہو اور راجو سب اسے جب تک دیکھتے رہے۔ جب تک کچی سڑک سے ہوتے ہوئے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

گاؤں کے بیکار لونڈے اور رمضان کے کچھ قدر دان بھی کچہری میں پہنچ گئے تھے۔ اسوقت تک رمضان کو وشواس تھا کہ بری ہو جائے گا، کیونکہ اسے گمان تھا کہ وہ بلا معاوضہ بنی نوع انسان کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ جس کیلئے اسے نہ قانون کچھ دیتا ہے اور نہ گاؤں کے باسی!

لیکن جب کرسی پر بیٹھے ہوئے منصف نے گھمبیرتا سے رمضان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تم نے بہت بڑا جرم کیا!'' تو رمضان کی آنکھیں کھل گئیں۔ منصف نے پھر کہا۔ ''بڑھاپے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تین مہینے کی قید سخت دیتا ہوں۔ شکر کرو بیمار بچ گیا۔ نہیں تو۔۔۔؟''

رمضان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ جس سہارے پر وہ اس وقت تک کھڑا تھا۔ وہ دھڑم سے ٹوٹ کر گر گیا۔ اسے اپنے گاؤں پر۔ اپنے فن پر غصہ آیا۔ لیکن قید کے خوف سے غصہ ابھرا نہیں۔ چہرے کی جھریاں گہری پڑ گئیں۔ آنکھوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

حیرت سے منصف کی طرف دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہہ نہ سکا پولیس کے ایک کانسٹبل نے اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں اور لے چلا۔

راستے میں جدھر سے ہتھکڑی پہنے ہوئے رمضان کو لیا گیا۔ کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ رمضان کو یاد آ گیا۔ ''لالہ۔ آج مٹی کی ڈولی لانا''۔ ایک بار اس نے کانسٹبل سے

کہا۔ ''مجھے ڈولی لینے دو۔ راجو انتظار کر رہی ہوگی''۔

کانسٹیبل ہنس پڑا۔ بولا۔ ''احمق۔ جا رہا ہے جیل کو۔ اور شوق ہے ڈولی کا!''۔

رمضان کی روح رونے لگی۔ سر نیچے کیئے ہوئے وہ چلا گیا۔ خیالات کے منجدھار میں اسے ساری دنیا ڈوبتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ ایک بار پھر آہستہ سے اس نے پوچھا۔ ''بھائی۔ تین مہینے کتنے ہوتے ہیں؟''

کانسٹبل بدمزاج تھا۔ جھلا کر بولا۔ ''تین ہی مہینے اور کتنے؟۔ کیا بھولی باتیں کر رہے ہو؟ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں!''

۴

شام کو رمضان کے گھر میں یہ خبر پہنچی۔ تو کہرام مچ گیا۔ اس کی بیوی نے سر کے سارے بال نوچ لئے۔ بہو کے دل میں خاوند کی موت کا جو زخم تھا۔ آج دوبارہ چھل گیا۔ اور راجو۔ وہ معصوم ننھی لڑکی۔ اسے کیا معلوم۔ 'لالہ'۔ کدھر گیا۔ وہ اس دن دیر تک آنگن میں بیٹھی۔ لالہ کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن لالہ نہ آیا۔ اور نہ ڈولی!۔

یہ حالات زیادہ دیر نہ رہے گے۔ دلاسا دینے والوں نے کہا۔ ''کیا ہوا'' رمضان کہیں گیا تو نہیں۔ تین مہینے کے بعد پھر آئیگا۔ اگر چاہتے ہو تو اپیل کر دو''۔ لیکن ان کے پاس روپے نہ تھے۔ اپیل کی خواہش دھری کی دھری رہ گئی۔ بات آئی گئی ہوئی!۔

رمضان کو جیل میں ایک مہینہ گزرا تھا۔ ایک دن ساس نے بہو سے کہا۔ ''کہو تو کل'' مالک سے مل آئیں۔ سنا ہے۔ جیل میں ملاقات ہو سکتی ہے''۔

بہو نے کہا۔ ''میں کیسے چلوں۔ جو دیکھے گا وہ کیا نام نہ دھریگا؟''

ساس چپ ہوگئی۔ بہو کی بات میں کافی معقولیت تھی۔ ساس نے تھوڑی دیر کے بعد پھر کہا۔ ''خیر۔ میرے پاس پانچ روپے ہیں خرچ بھی ہوں گے۔ تو کافی ہیں اور دیکھنا

میرے بعد ذرا خبرداری سے رہنا میں راجو کو بھی لے جاؤنگی۔ مالک کو مارے اس کی محبت کے ہول ہوتا ہوگا۔ اسے دیکھ کر پیاس تو بجھ جائیگی اس کی"۔

۵

رمضان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے دل میں محبت کا بے پناہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سفید وردی پہنے ہوئے سلاخوں کے پیچھے کھڑی قیدی کی روح کھال سے پھٹ کر باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اور سلاخوں کے باہر حیران نظروں سے معصوم بچی اپنے بھیانک 'لالہ' کو دیکھ رہی تھی۔

یہ رمضان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "راجو!" راجو نے زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں کی حیرت سے کہا۔ "ہاں لالہ"۔

رمضان نے پھر کہا۔ "ڈولی لوگی؟"

بچوں کی فطرت بھی کیا پاکیزہ ہوتی ہے۔ راجو سارا خوف بھلا کر بولی۔ "نہیں تو لالہ"۔ لالہ کا لفظ راجو کی زبان سے رمضان نے سنا تو اس کی آنکھیں اپنے آپ ہی تھوڑی دیر کے لئے بند ہوگئیں۔ ایک کی ممتا پر دوسری کا پیار غالب آیا۔ جسے دیکھ کر دور کھڑا پہرے دار بھی رو پڑا!"

رمضان نے کہا "لے جاو اسے میں مر جاؤنگا!"

اسکی بیوی کی آنکھوں سے آنسوں کی ندی بہہ رہی تھی۔! رمضان نے پھر کہا۔ "لے جاؤ۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو"۔

جب راجو کو دادی واپس لے چلنے لگی۔ تو راجو نے پوچھا۔ "لالہ نہ آئیگا ماں؟"

لالہ یہ سنکر جلد جلد اپنی کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ اور سنتری نے دروازہ بند کر دیا۔

۶

قید سے چھوٹ کر جب رمضان گھر آیا۔ تو وہاں نہ راجو تھی نہ راجو کی ماں! بیٹی کی طرح پالی ہوئی بہو کی بے اعتنائی سے اسے دھکا سا لگا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ بیٹی اور بہو میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ بہو چھاتی کا گوشت کھا کر بھی بیٹی نہیں ہو سکتی اور بیٹی دھتکاری جانے پر بھی بیٹی ہی رہتی ہے۔

اس کی بیوی نے اسے کہا۔ کہ بہو کے ماں باپ نے اس کی دوسری شادی کا انتظام کر دیا۔ اور اسے زبردستی لے گئے۔

شروع شروع میں رمضان کو راجو کی جدائی شاق گزری۔ لیکن جلد ہی اس نے من پر قابو پا لیا۔ البتہ جب اسے راجو کی ڈولی یاد آتی۔ تو کلیجہ مسل کے رہ جاتا۔ تین پیسے کی چیز وہ راجو کو نہ دے سکا۔ جواب تک بے گناہ تھی۔ اور جسے دادا پر کافی حق تھا۔ باغیچے میں کام کرتے کرتے جب اسے گناہ اور حق کی بات یاد آتی۔ تو وہ بے تاب ہو جاتا۔ اور اُٹھ کر پاس کی مسجد میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اس جگہ اسے عجیب کشش اور شانتی سی محسوس ہوتی۔

ہوتے ہوتے گیارہ برس بیت گئے۔ رمضان کی بیوی بھی مر چکی تھی۔ موروثی مکان میں پہاڑ کی چوٹی پر اُگے ہوئے تنہا درخت کی طرح صرف رمضان ہی رہ گیا تھا۔

اب اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ زیادہ وقت مسجد کی چٹائی پر گزار دیتا شام ہوتی تو اُٹھ کر چلا جاتا!۔

ایک دن وہ مسجد کی ندی پر وضو کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی اس کے قریب وضو کرنے بیٹھا۔ اور بولا۔ ''سنا تم نے؟''

رمضان نے پوچھا ''کیا؟'' اُس آدمی نے کہا لڑکیاں خود اپنے لئے شوہر پسند کرتی ہیں۔''

رمضان نے کہا۔ ''لاحول لاقوۃ!'' اس آدمی نے کہا۔ ''اور ان کے والدین بڑے

فخر سے کہتے ہیں۔ تعلیم میں روشنی ہے!''

رمضان نے کہا۔'' یہ کافروں کا کام ہے مسلمان عورتیں پردے کی شہزادیاں ہیں''۔اس آدمی نے کہا۔'' بھائی م سان یہ کرنے لگے۔ مسلمان! اعتبار نہ ہو۔تو سرائے پور کے رحیم بٹ کے گھر چل کر دیکھ آؤ۔ اسکی بیٹی نے اپنے لئے خود شوہر پسند کیا ہے!''۔

رمضان وضو کرنا بھول گیا۔ اس نے پوچھا۔'' ایں۔ سرائے پور کے رحیم بٹ کی بیٹی؟۔''

اس آدمی نے کہا۔'' ہاں۔ یہی تو کہہ رہا ہوں''۔

رمضان جلد اُٹھا۔ اور نماز پڑھے بغیر ہی اپنے مکان کو چل دیا۔

شام ہو رہی تھی۔ وہ باغیچے میں ایک آلوچے کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مسجد سے موذن اذان دے رہا تھا۔ لیکن رمضان کے دل میں نہ جانے کون اذان دے رہا تھا۔

باغیچے میں لگے ہوئے درخت اب بہت بڑے ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے آج پھر بارہ برس کے بعد اپنا جوان بیٹا یاد آ گیا۔ آج وہ زندہ ہوتا۔'' تو کیا ہوتا۔ ہاں، کیا ہوتا۔؟''

۷

سرائے پورے کے رحیم بٹ کے گھر میں دھوم دھام ہے۔ شامیانے اور سائبان لگے ہیں۔ گیس لیمپوں کی روشنی میوہ دار درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر نکل رہی ہے۔ آنگن میں ڈھول۔ نقارے اور شہنائیاں بج رہی ہیں۔ شامیانے کے نیچے برات کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ سائبان کے نیچے عورتیں گیت گا رہی ہیں۔

رحیم بٹ کے دوست اور رشتہ دار انتظام کرنے میں مصروف ہیں۔ بچے اور لڑکیاں خوشی سے ادھر ادھر بھاگی جا رہی ہیں۔ آج رحیم بٹ کی اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہے!

برات سے کچھ دیر پہلے ایک بوڑھا صحن میں داخل ہوا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بہت دور سے آیا ہے اور تھک کر چور ہو گیا ہے۔

انتظام کرنے والوں میں سے ایک نے اسے دیکھا۔ اور بھویں تان کر کہا۔ ''باہر بیٹھو۔ ابھی برات چڑھی نہیں۔ اور تم لوگ آدھمکے!''

بوڑھے نے کہا۔ ''میں تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر سستا کر چلا جاؤں گا''۔

اس نے بگڑ کر اس کا نخیف ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے گھسیٹ کر باہر نکال دیا۔ لیکن بوڑھا وہاں نہ بیٹھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ پھر اندر آیا اور اسی جگہ بیٹھ کر اندر دیکھنے لگا۔ جہاں دلہن سنواری جا رہی تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے نقاروں کی آواز سنائی دی۔ عورتوں کے گیت اور اونچے ہو گئے۔ بچے اور بوڑھے مچل کر کہنے لگے۔ ''!آ گیا دولھا''۔

استقبال کے بعد براتی شامیانے کے نیچے بٹھائے گئے۔ روٹی کھلا کر مذہبی رسوم سرانجام دئے گئے۔ اور جب برات لوٹ کر جانے والی تھی۔ ایک بچے نے دلھن کی ماں کے ہاتھ میں رومال دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا ہے''۔؟

اس نے حیران ہو کر رومال کھولا۔ اٹھنیوں سے بھرا ہوا۔ تب پوچھا۔ ''یہ کس نے دیا؟'' لڑکے نے کہا۔ ''آنگن میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے بابا نے۔ کہا یہ راجو کی ماں کو دے آنا''۔

دلہن کی ماں نے بے اختیار ہو کر کہا۔ ''لالہ'' اور دوڑتی نیچے آ گئی۔ لیکن جہاں اس لڑکے نے بوڑھے کو دیکھا تھا۔ وہاں وہ نہ تھا۔ لڑکے نے کہا۔ ''ابھی یہاں تھا۔

دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا۔اس نے مجھے کہا۔ یہ راجو کی ڈولی کے لئے پیسے ہیں۔''

راجو کی ماں کو تمام باتیں یاد آ گئیں۔ اور ان کے ساتھ ہی آنسوؤں کے چند قطرے بھی اسکی آنکھوں سے گر گئے۔

راجو کی ڈولی برات کے ساتھ ایک راستے سے نکل گئی۔اور دوسرے راستے سے ایک بوڑھا مُڑ مڑ کر دیکھتا ہوا جلد جلد جا رہا تھا۔نقاروں کی آواز میں اسے اپنا جسم آج ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔آج اپنی ساری پونجی دے کر وہ اس حق کو ادا کر چکا۔جو بار برس پہلے تین پیسے خرچ کر کے ادا ہو سکتا تھا۔!!



لباس تلے

وِشومبر بہت خوش تھا......

اُسے ساری دُنیا پھولوں پر لوٹتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ مالک نے اُسے بڑے دن کی خوشی میں اپنا پُرانا اوور کوٹ عطا کیا تھا۔ کوٹ بظاہر نیا دکھائی دے رہا تھا۔ صرف اُوپر کا پُلش کثرتِ استعمال سے اُڑ گیا تھا۔ جیبیں پھٹ گئی تھیں اور کہیں کہیں سے استر بھی غائب تھا۔

لیکن پُلش کا کیا ہے۔ گرمی تو کپڑے میں ہوتی ہے جو میل جم جانے کے سبب موٹا نظر آ رہا تھا اور جیبیں......اُن کی مرمّت آسان تھی۔

آج اُسے گھر کے چھوٹے بڑے حتّٰی کہ بدصورت مالکن بھی شریف اور حسین دکھائی دے رہی تھی۔ ہاں حسین اور شریف جس نے اس عطیے پر اعتراض نہ کیا۔ دراصل قیمتی لباس تلے ان لوگوں کے سینوں میں بہت بڑے دِل ہوں گے۔ جو ایسی بخشش کو بغیر کسی کوفت کے برداشت کر سکتے ہیں ورنہ کہاں چھ روپے تنخواہ لینے والا وِشومبر اور کہاں بابو سری کنٹھ کا اوور کوٹ!

''بھگوان نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ صرف اس لئے کہ ان کی نیّت صاف ہے۔'' اُس نے دِل میں سوچا۔

اُس نے اپنے کمرے میں کوٹ کو پہن کر بغور دیکھا۔ بالکل نیا کوٹ تھا۔ دورویہ ہڑی کے بڑے بڑے بٹن لگے تھے۔ بائیں بغل میں چھوٹی سی جیب تھی جہاں مالک ریشمی رومال رکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دو بڑی بڑی جیبیں تھیں۔ لیکن دونوں پھٹی ہوئیں اور کوٹ بظاہر نیا تھا۔

''مالک انسان نہیں' دیوتا ہیں'' وشومبر نے اپنے دِل سے کہا۔ ''انسان کو خوب پہچانتے ہیں۔''

اس سے قبل وہ کئی سال سے یہ کوٹ دیکھنے کا' اسے جھاڑنے کا' اسے تہہ کر کے فینائل چھڑک کے رکھنے کا عادی تھا اور اُن دِنوں یہ کوٹ زیادہ نیا نہ تھا پلش بھی اُڑ گیا تھا۔ جیبیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ استرِ بھی غائب تھا۔ لیکن آج اُسے اس میں سب کچھ نیا اور اپنا پن ساد کھائی دیتا تھا۔ پپوٹوں میں چُھپی ہوئی عقیدت پر بے پناہ محبّت چھا گئی۔ دِل میں اپنی چیز کا پیار اُمڈ آیا۔ کمرے میں دو چار قدم ٹہلنے پر اُسے اپنا بدن بھلا بھلا دکھائی دیا۔ بالکل مالک جیسا......! اس کے بغیر وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ اپنی پُر شور جوانی بھیگی ہوئی، جن کی مچھلیاں پھٹی ہوئی قمیض سے اُبھر ہوئی تھیں۔ اپنا دو ہاتھ چوڑا سینہ۔ میلی اور تنومند ٹانگیں۔ کچھ بھی اُسے دکھائی نہ دیا۔ اُس کی نگاہوں کا مرکز اور کوٹ تھا یا اُس سے پرے مالک کی صاف نیت!

اب وہ مکمّل انسان تھا۔ کوٹ کی کمی نے اُسے کس قدر نیچے دھکیل دیا تھا۔ اس کا احساس اُسے اب ہونے لگا اب وہ اکڑ کر بازار بھی جائے گا۔ دُکان دار سے جھگڑا بھی کرے گا۔ اور تو اور سب کچھ کر سکے گا۔

ایک بار نفسانی خواہشات سے بے قابو ہو کر اُس نے ایک طائف کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا تو کتنی آفت آ گئی تھی۔ بازار کا بازار جمع ہو گیا تھا' حالانکہ وہ طائف جاذب نظر تھی نہ جوان۔ لیکن پیاس کے وقت کون دریا کی لہروں کا حُسن دیکھتا ہے۔ وہ شرمندہ ہو کے چپکے

سے لوگوں کی گالیاں سُن کر بھاگ نکلا تھا......

شاید بات یہ تھی کہ اُس دن اُس کے بدن پر میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے تھے۔ لیکن اب......اب قسمت کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ اُسے اوورکوٹ ملا تھا۔ اوورکوٹ پہن کر نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی شریف اور سب کچھ کرنے کا مجاز ہے۔ اُس کے متعلق شک و شُبہ کرنے کی مطلق گنجائش نہیں رہتی۔ اوورکوٹ انسان کے سب عیب حتیٰ کہ پھٹی ہوئی قمیض اور گھسی ہوئی پیٹھ تک چُھپا لیتا ہے۔

اُس نے کوٹ کو جھاڑ کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور اُوپر میلی چادر پھیلا دی۔ پہلے وہ کبھی کبھی کام سے اُکتا جاتا تھا۔ لیکن تازہ عطیے نے اُس کے دِل میں زیادہ کام کرنے کی خواہش سی پیدا کر دی۔ کاش ایسا کام مِلے جس کے لئے کوسوں دور جانا پڑے۔ کوٹ پہن کر تکان بھی محسوس نہ ہوگی۔ قدموں میں ہوا کی تیزی اور رفتار میں بجلی کی سُرعت پیدا ہوگی۔ اور بدن ......گرم اور حسین۔ حسین اور شریف۔ بالکل مالک جیسا نظر آئے!

بابو سری کنٹھ نے اپنے لئے دوسرا کوٹ سلوا لیا تھا۔ اُن جیسے صاحب دولت مند لوگوں کے لئے اوورکوٹ نہایت ضروری ہے اور خصوصاً سردیوں کے آغاز میں جب سرد اور خشک ہواؤں میں بھالے چھپے ہوتے ہیں۔

بڑے دِن کی خوشی کے ساتھ ساتھ نئے کوٹ پر بحث بھی ہو رہی تھی۔ یار دوستوں کی نظریں کپڑا، سلائی، ڈیزائن پرکھ رہی تھیں۔

"کپڑے کا ڈیزائن جاذب نظر ہے!" ایک نے کہا۔

"سلائی بہترین ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"لیکن اس میں سُوت بھی مِلا جُلا نظر آتا ہے۔" تیسرے نے ہنستے ہنستے خطرناک انکشاف کیا۔

بابو سری کنٹھ، اُن کی بیوی اور باقی دو سب چونک اُٹھے!

''سُوت؟''

''کم سے کم دس فیصدی ہو گا...... لیکن قابل برداشت! اور تو اور آج کل خالص اُونی چیز ملے گی کہاں سے؟'' انکشاف کرنے والے دوست نے سنجیدگی سے کہا۔

بابو سری کنٹھ نے جلد جلد کوٹ کے اندر کی طرف سے ایک دھاگا کھینچ لیا اور اُسے دیا سلائی دکھادی۔ دھاگہ آہستہ آہستہ جل کر ختم ہو گیا۔

''دیکھ لیا صاحب! اُون ہوئی تو یک لخت جل کر سکڑ جاتا۔''

بابو سری کنٹھ کی حیرانی میں اضافہ ہوا۔ تعجّب ہے!'' انہوں نے بیوی سے کہا

وشومبر دروازے پر یہ باتیں سُن رہا تھا۔ سُوت اور اُون کی پہچان اُس کے لئے بالکل نئی تھی۔ مالک کے فرشتہ ہونے میں اب کچھ بھی باقی نہ رہا۔ پہلے وہ انسان پہچان سکتے تھے، اب سُوت اور اُون بھی پہچانتے ہیں۔ اُسے دکان دار، جس کے ہاں سے مالک نے یہ کپڑا خریدا تھا، بہت غصّہ آیا۔ ''کمینہ، سالا...... نیّت دیکھے بغیر ہی دھوکا دیتا ہے۔''

''اور میرا کوٹ ......'' اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا۔ وہ دَبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوٹ کو کھونٹی سے اُتار کر جیب کے پاس سے ایک دھاگا نِکال لیا۔ اور اُسے دیا سلائی دکھادی۔ دھاگا یک لخت جل کر سکڑ گیا۔ دُھوئیں میں کراہت نہ تھی۔ بُھنے ہوئے گوشت کی سی بُو تھی۔

''آہاہا...... خالص اُون......'' اُس نے فرطِ مسرت میں اُچھل کر کہا ''مجھے دھوکہ نہیں لگا...... میرے کوٹ میں سُوت، دس فصید سُوت نہیں۔'' اُس نے اپنے آپ ہی سے کہا۔

''آخر بابو جی تو نادان نہیں جو آٹھ برس کے نوکر کو سُوت اور اُون کا بنا ہوا کوٹ

دے دیتے۔ اُنہوں نے اُسے انسان پہچان کے ہی یہ بخشش دی تھی۔

بحث ختم ہو چکی تھی۔ بابو سری کنٹھ کو نقصان کا بے حد افسوس تھا...... وہ ہزاروں روپے کے مالک تھے۔ لیکن جان بُوجھ کر اُنہوں نے ایسا نقصان نہ اُٹھایا تھا۔ وشومبر دوبارہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اُس وقت کام کا طلب گار تھا۔ جس کے لئے اُسے کہیں دُور جانا پڑے۔

مالک نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ ''میرا پُرانا اوورکوٹ خاص اُونی ہے۔ وہ میں نے جیون سنگھ کی دُکان سے لیا تھا۔ جبھی بارہ برس چلا۔''

وشومبر کے دِل میں مالک کے ان الفاظ نے ذرا خراش سی پیدا کر دی۔ کاش! مالک نے میر پُرانا اوورکوٹ نہ کہا ہوتا۔ وشومبر کا کوٹ کہا ہوتا۔ تو وشومبر کس قدر پُھول جاتا۔ پھر بھی اُس کا بدن مُسکرا اُٹھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں فرطِ خوشی سے پُھول گئیں اور سینے میں کُشادگی سی آ گئی۔

مُسکرا کر اُس نے آہستہ سے کہا۔ آپ......؟

اس سے آگے بولنے میں اُسے خوف سا محسوس ہوا۔ بولے یا نہ بولے، لیکن گھر اپنا تھا۔ مالک اپنا تھا۔ مالکن اپنی تھی۔ سبھی اپنے تھے۔

مالکن نے نئے کوٹ کو اُوپر نیچے کرتے ہوئے بے پروائی سے پوچھا ...... ''کیا؟'' وشومبر کی ہلکی سی مسکراہٹ دَبے ہوئے قہقہے میں بدل گئی۔ اُس کے گم گشتہ الفاظ کو سہارا مِل گیا۔ وہ ایک قدم اندر گیا۔ بدصورت مالکن اُسے اس وقت بے حد حسین دکھائی دی۔

وشومبر نے آہستہ سے کہا۔ آپ میرا کوٹ پہنیں ......وہ خالص ......'' بابو سری کنٹھ اور اُس کے احباب ہنس پڑے۔ لیکن مالکن کا سارا حُسن، جو ابھی ابھی وشومبر ہی کو دِ

کھائی دیا تھا' بدصورتی میں تبدیل ہوگیا۔

''بے وقوف......گدھا!'' اُس نے چمک کر کہا۔

وشومبر کی مُسکراہٹ بُلبلے کی طرح سطح ہی پر غائب ہوگئی اور دوہاتھ چوڑا سینہ سکڑ کر پُرانے اوورکوٹ کی چھوٹی جیب کے برابر ہوگیا۔

اس نے اپنی طرف سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بیوقوف تھا اور گدّھا! حالانکہ گدھا اُس کے خیال میں اتنا بے وقوف نہیں جتنی وہ کم ظریف طوائف جس نے اُس کے محسوسات کا اندازہ لگائے بغیر ہی اسے بے عزّت کر کے لوٹا دیا تھا۔ اُس دن اُس کی جیب میں پورے آٹھ آنے تھے۔ اور یہ رقم اُس نے صرف اُسی کے لئے بچا بچا کر رکھی تھی۔ لیکن بے وقوف...... محض بے وقوف! جس نے دُوار پر آئی ہوئی دولت ٹھکرادی۔ طوائف نے اُس کی جیب میں پیسے نہیں دیکھے' صرف اُس کا لباس دیکھا۔ لباس تلے کیا تھا؟ یہ اُس کی فریب خوردہ نظریں نہ دیکھ سکیں۔

وہ کمرے سے نِکل ہی نہ سکا۔ فریب مسّرت پروہ دروازے سے ایک قدم اندر آگیا تھا۔ اس وِقت وہ صرف ایک ہی قدم دِکھائی دیا۔ لیکن اب جیسے کوس بھر زمین دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مُشکل سے باہر نِکلا۔ اس کا بدن ٹوٹا ہوا تھا۔ گھر ہی میں اس نے کتنا لمبا سفر کیا تھا۔ کاش! اوورکوٹ پہن کر کیا ہوتا''۔

دوسرے دِن گھر کا کام اور مالک کے کام پر چلے جانے کے بعد اُس نے اوورکوٹ پہنا۔ شیشے کو سامنے رکھ کر صافہ باندھا۔ رات کو دھویا ہوا پائجامہ کہیں کہیں سے گیلا تھا۔ لیکن ٹانگوں نے' پیٹ نے' یارانو نے نمی بالکل محسوس نہ کی۔ اُسے اتنا بھی خیال نہ رہا کہ پائجامے میں نیل کہاں کہاں زیادہ لگی ہے۔ اور کہاں کہاں میل اُبھر گیا ہے۔ اُسے اس وقت اپنا آپ خوبصورت دِکھائی دیا اور جب ہڈی کے بڑے بڑے بٹن کاجوں میں پیوست

ہو گئے تو وہ بہت اچھا......نہیں مکمّل انسان سا نظر آنے لگا۔ جیبوں کا استر پھٹ گیا تھا۔ لیکن باطن کو کون دیکھتا ہے؟ بارہ آنے کی ریز گاری اُس کی واسکٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔

وہ آج سارے شہر کا گشت لگانا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ہزاروں بار شہر کا گشت لگا چکا تھا۔ اور شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ لیکن اُن دِنوں وہ صرف وشومبر تھا' آج مکمل انسان ہے۔ آج کی خوشی میں اُسے بے حد لذّت اور شیرینی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ زمین پر نہیں' ہوا پر اُڑا جا رہا ہے اور سڑکیں جن سے وہ مانُوس ہے آج اُجلی اور بالکل مختلف سی نظر آ رہی ہیں۔

وہ ہر راہ چلنے کو بغور دیکھتا اور اپنی اور اُس کی پوشاک کا موازنہ کرتا۔ اُن میں کتنے ہی شریف اور شاید اعلیٰ افسر بھی تھے۔ لیکن اُن کی پوشاک' چال ڈھال اور طرزِ رفتار میں اُسے اپنے سے کچھ بھی زیادہ نہ دکھائی دیا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ایسے انسانوں میں اکثر پتلے پتلے اور سُوکھے ہوئے سے تھے وہ خود اُن کے مقابلے میں کافی مضبوط تھا۔ ڈھیلے ڈھیلے! کون جانے خالص اُونی یا دس فصید سُوت والے۔

وہ آگے چلتا گیا' بالکل غیر ارادی طور پر۔ کبھی کبھی جب بے اختیار اس کے ہاتھ جیبوں میں چلے جاتے اور اُنگلیاں پیٹ سے چھو جاتیں تو اُسے احساس ہوتا کہ اوورکوٹ کی جیبیں پھٹی ہوئی ہیں۔ وہ گھبرا کر آگے پیچھے دیکھتا کہ کسی نے اُنگلیوں سے پیٹ کو چھوتے تو نہیں دیکھا۔ لیکن دُنیا باطن کو نہیں دیکھتی۔ وہ صرف ظاہر پرست ہے اور وشومبر ظاہر اطوار پر آج بالکل شریف اور مکمل انسان دکھائی دے رہا تھا۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر رضائیاں اوڑھے کتنے ہی بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نقل و حرکت سے' اُن کے لباس سے اور اُن کی منتشر نگاہوں سے مجبوری اور زندگی سے تنفّر ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن اُن کے پیلے پیلے چہروں پر اطمینان تھا......اطمینان جو

انتہائی نا اُمیدی کے بعد خود بخود حاصل ہوتا ہے دُنیا اُن سے بے پروا تھی۔ اُس نے اُنہیں ظاہر پرستی کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے مال کی طرح ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اُن کا باطن ابھی پرکھا نہیں گیا تھا۔ اُن کے لباس تلے پُر شور جوانیاں بھی تھیں اور دہکتی ہوئی بھٹیاں بھی۔ جو دھیرے دھیرے وہیں فٹ پاتھوں پر آپ ہی بجھی جا رہی تھیں۔ اُن کی پوشیدہ آگ میں کتنی حرارت، کتنا جوش اور کتنی روشنی تھی۔ یہ کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ دُنیا دَبی جوالا کی طرح اُن کی روشنی سے بیزار، اُن کے وجود سے مُنکر اور اُن کی حرارت سے متنفِر تھی۔ محض بے کار لوگ...... جو سڑکوں پر کُتوں کی طرح مرنے کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں، جو کھاتی پیتی دُنیا کو اپنی بے جان آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ رہتے ہیں اور ترستے ترستے، آہیں بھرتے بھرتے، ہاتھ پھیلاتے پھیلاتے وہیں اُونی دھاگے کی طرح یک لخت جل کر سکڑ جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔

اور موٹروں میں گھومنے والے، رُخساروں پر غازہ ملنے والے دُنیا کو اپنی ٹھوکروں میں اُچھالتے پھرتے ہیں۔ دُنیا نے اُن کے ظاہر و باطن دونوں کو پرکھا ہے اُن کے لباس کی نفاست اور لباس تلے کی سیم وزر سے اَٹی ہوئی جیبیں دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں وہ ان کی بجھی ہوئی حرارت سے ٹھنڈی پڑی ہوئی بھٹیوں سے اپنا نظام چلا رہی ہیں اور اُنہیں سُوت کے دھاگے کی طرح آہستہ آہستہ جینے اور ختم کرنے کی مُتمنی ہیں۔

''یہ لوگ اوورکوٹ کیوں نہیں پہنتے؟'' وِشومبر نے اپنے دِل سے پوچھا۔ پھر ایک لیٹے ہوئے بھکاری سے بولا۔ ''تمہارے پاس اوورکوٹ نہیں؟''...... میرا مطلب ہے خالص اُونی اوورکوٹ!

بھکاری نے نرالی بات سُنی۔ ''اوورکوٹ! خالص اُونی!!'' وہ وِشومبر کا مطلب نہ سمجھ سکا اور نہ سمجھنے کی کمزوری ہمیشہ مُسکراہٹ سے چھپائی جاتی ہے۔

دوسرے ہی لمحہ میں بھکاری کے مطمئن چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسی طرح اُس نے لیٹے ہی لیٹے کہا۔ ''شُکر ہے جیتے ہیں!''

وشومبر نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اوورکوٹ کے بغیر ہی وہ اپنے جینے پر شُکر کررہا تھا اور مطمئن تھا۔

''کاش! ان لوگوں کے بھی مالک ہوتے جو بڑے، دن کی خوشی میں انہیں اپنے پُرانے اوورکوٹ عطا کرتے۔'' وہ اور آگے بڑھا۔ اُسے گھر یاد ہی نہ رہا۔ بدن پر پہنے ہوئے کوٹ اور واسکٹ میں لیٹی ہوئی ریزگاری نے اُس کے جذبات میں رنگ بھر دیا تھا۔

اُس نے اپنے دِل میں کچھ سامان خریدنے کی بھی ٹھان لی۔ صافہ باندھنے کا شیشہ جو مالک کے کمرے سے کبھی کبھی اُٹھا لاتا تھا۔ ایک چمٹا جس کے بغیر چلم پر آگ رکھتے وقت اُس کی اُنگلیاں جُھلس جاتی تھیں۔ ایک خوشبودار صابون کی ٹکیا۔ فینائل کی گولیاں جو گرمیوں میں اوورکوٹ کے بچاؤ کے لئے ضروری تھیں...... سامنے تصاویر کی دُکان تھی۔ اوورکوٹ پہنے کچھ لڑکے اور لڑکیاں تصویریں خرید رہی تھیں۔ وشومبر بھی دُکان پر چڑھا۔ اُسے دکان پر چڑھتے وقت کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی۔

اُس کے کمرے میں کوئی تصویر نہ تھی ماسوائے ایک کرم خوردہ تصویر کے جو وہ نہ جانے کب کسی بزاز کی دُکان سے اُٹھا لایا تھا۔

اور سامنے شلفوں پر، الماریوں میں، دیواروں پر دیدہ زیب تصویریں لٹک رہی تھیں۔ حُسن اور جوانی کی نیم عُریاں اور نیم خنداں تصویریں! جو مکمل انسان کے کمرے کی زینت بننے کے لائق تھیں۔ اس نے ایک ہی نظر ساری تصویروں کا جائزہ لیا۔ کاش! یہ ساری تصویریں اُس کے کمرے کی دیواروں پر لٹکتیں تو اُس کی زندگی کتنی مسرت میں گزاری جاتی!

دُکان کے مالک نے قریب آ کر پوچھا۔ ''حکم؟''

وشومبر شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ حکم کرنے کا عادی نہ تھا، حکم کی تعمیل کرنا اُس کی خُو تھی۔ وہ دراصل یوں ہی دُکان پر چڑھا تھا۔ اور اوورکوٹ پہن کر دُکان پر یوں ہی چڑھنا کچھ بُرا نہیں۔ یوں بھی تصویر اُس کے ضروری سامان کی فہرست میں نہ تھی!

وشومبر کی حیرت کو بھانپ کر دکان دار نے پھر پُوچھا۔ ''کیا حکم ہے سرکار؟ کتنی حلیمی اور کتنا پیار تھا ان الفاظ میں! وشومبر کے کان ایسے الفاظ سے نا آشنا تھے۔ مکمل انسانوں کی دُنیا میں کتنی راحت اور کتنی محبت ہوتی ہے یہ اُسے اُس وقت معلوم ہوا جب وہ خود مکمل انسان کے بھیس میں اس دُنیا میں آ گیا۔ وہ کئی بار پہلے بھی اس دُکان کے آگے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن دُکان دار نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ آج وہ بات نہ تھی۔ آج ہزاروں روپے کا مالک اُس سے پوچھ رہا تھا۔'' کیا حکم ہے سرکار؟

اور وشومبر کے واسکٹ میں بارہ آنے تھے۔ اوورکوٹ کی پھٹی ہوئی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُس کی انگلیاں ریزگاری سے چھو گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

اُس نے ایک نیم عُریاں فلم ایکٹرس کی تصویر اپنے لئے منتخب کی۔ جس کی باریک ساڑھی پر ستارے کا کام کیا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی سڈول ٹانگیں، گول گول بازو، چاند سا شفاف سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دُکان دار نے تصویر کاغذ کے لفافے میں ڈال کر اُس کے آگے رکھ دی اور کہا۔ ''ڈھائی روپے!''

وشومبر کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ نتھنے پھُول گئے۔ وہ ہوا میں لٹک رہا تھا۔ اب زمین پر آ گرا۔ ''اتنی مہنگی!'' اُس نے سُوکھی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''تصویر ہی تو ہے!''

خرید و فروخت کرنے والی لڑکیوں نے اُس کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور زیرِ لب مُسکرا کر آنکھیں پھیر لیں اور دُکان دار نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وشومبر نے

محسوس کیا جیسے وہ قہقہہ نہیں توپ ہے۔ اُسے اپنے حُسنِ انتخاب پر افسوس آ گیا اور اپنی نادانی پر رنج۔ جس نے اُسے دُکان پر چڑھنے کی ترغیب دی۔ حالانکہ تصویر اُس کی ضرورت زندگی کی فہرست میں نہ تھی!

''نہ جانے کِس کا کوٹ پہن رکھا ہے غریب نے؟''

ایک شوخ لڑکی نے مالکِ دُکان سے ہنستے ہنستے کہا۔ ''تصویر بھی خُوب پسند کی تھی ...... ہاہاہا۔''

وشومبر کا چہرہ ندامت سے لال ہو گیا۔ اُسے اس وقت گیلے پائجامے کی نمی رانوں پر محسوس ہوئی اور کہیں کہیں اُبھرا ہوا میل بھی دکھائی دیا۔

''کِس کا کوٹ؟'' دُکان سے اُتر کر اُس نے اپنے دِل سے پوچھا۔ میرا مالک سوت اور اُون پہچان سکتا ہے' انسان پہچان سکتا ہے اور یہ لفنگا ...... بدمعاش ......''

ایک گلی میں داخل ہو کر اُس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھا ''ہاں''۔

وہی اوورکوٹ تھا۔ وہی جو مالک نے اُسے دیا تھا۔ جو اُس کا تھا۔ صرف اُس کا! غریب کے بدن پر اچھا کپڑا دیکھ کر بھی یہ لفنگے خوش نہیں ہوتے!

یہی سوچتا وہ شہر کی طرف مُڑا۔ شیشہ' چمٹا' صابون کی ٹکیا اور فینائل کی گولیاں سب کچھ بُھول گیا۔

تفریح طبع کے لئے اُس نے سگریٹ کی ڈبیا خرید لی اور ایک پان بھی مُنہ میں رکھ لیا۔

بے عزّتی کا اُسے زیادہ احساس نہ ہوا۔ دُنیا میں سبھی کچھ ہوتا ہے۔ دھوکا' فریب' گالی گلوچ۔ یہاں سبھی جیون سنگھ نہیں۔ جو خالص اُونی کپڑا دیں جس میں سُوت کی آلائش تک نہ ہو'' اُسی وقت اُسے وہ طوائف یاد آ گئی جس نے اُسے کچھ عرصہ پیشتر بے عزّت کیا

تھا۔ صرف اس لئے کہ طوائف کی نگاہوں نے ظاہری وِشومبر کو دیکھا تھا۔ باطنی وِشومبر کو نہیں۔ جہاں مٹی اور گھاس پھوس کے نیچے ڈھکی ہوئی برف کی طرح محبت تھی۔ پگھلنے کے لئے بے قرار محبت! طوائف کو بتا دینا چاہتا تھا دُنیا کتنی اندھی ہے۔ جسے اُس نے ایک دِن پھٹے ہوئے کپڑوں میں دکھ کر دُھتکارا تھا۔ آج وہی بھونرے کی طرح اُس کے حُسن کا رس چوس کر گاتا گاتا چلائے گا۔ اور اندھی دُنیا' اندھی عورت' اندھا بازار دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے گا۔

اس کارواں رواں دماغ کی اس جرت آفرینی پر جھومے گا اسے اتنا بھی خیال نہ رہا کہ منہ مین رکھا ہو پان کہاں گیا؟ اُس کی پیک کہاں گئی؟ ہاں شیرینی اُس کے منہ میں جاتی تھی۔''

وہ سیڑھیاں چڑھا۔ آنکھ سے اشارہ کرنے کے دِن اُسے کوّے کی طرح چوکّنا ہو کر اُدھر دیکھنا پڑتا تھا۔ پھر اُس نے بائیں آنکھ کو زور سے جھپکا دیا تھا۔ لیکن آج سڑک پر چلنے والوں کی موجودگی میں' دُکان پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے' سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا ہوا اُوپر چڑھا۔ دروازے پر میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ جس پر خالص اُون کے دھاگے سے نقوش کاڑھے گئے تھے۔ کبھی یہ پردہ بہت جاذب نظر اور خوبصورت ہوگا۔ لیکن اب طوائف کی طرح اُس کے نقوش مٹے ہوئے اور پھیلاؤ میں بے ترتیبی سی آگئی تھی۔ وہ ذرا ٹھٹھک دگیا۔ لیکن عارضی طور پر...... وہ آج بہت مضبوط تھا۔

''اندر آیئے!'' شباب سے ڈھلی ہوئی طوائف نے اُسے دیکھتے ہی پُر تپاک لہجے میں کہا۔

وِشومبر نے بوٹ اُتارا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی سلام کیا۔

''خان نے بھیجا ہے؟'' طوائف نے پوچھا۔

وِشومبر سوال پر حیران رہ گیا۔ طوائف نے پھر پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

وِشومبر نے سگریٹ کو اُنگلیوں ہی میں بُجھا دیا۔ اُسے آگ کی حرارت محسوس ہی نہ ہوئی۔ اُس نے آہستہ سے مصنوعی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''میں......خود آیا ہوں!''

طوائف کے پھیکے سے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ خوب! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔

وِشومبر کے غیر ارادی جذبات مچل اُٹھے۔ اُسے پیاس بھی لگ گئی۔ دریا اُس کے سامنے تھا اور دریا کی لہروں کا حُسن بھی!

طوائف ناز و ادا سے اُس کے قریب شکستہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اُس کے ساتھ ہی وِشومبر بھی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ آپ کیا پسند کرتے ہیں، وِمٹو یا روز؟

وِشومبر کے لئے دونوں چیزیں نئی تھیں۔ پھر بھی کمزوری کو چھپاتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''روز!''

دوسرے لمحے میں ایک بوڑھا روز کی بوتل اور دو گلاس لے کر حاضر ہو گیا اور بولا۔ ''ڈھائی روپے!''

وشومبر شکستہ صوفے کی سُپرنگ والی گدیوں پر بیٹھا تھا۔ ڈھائی روپے کا لفظ سن کر اسے محسوس ہوا، جیسے اُس کے نیچے عمیق غار ہے جس میں وہ اُترتا جاتا ہے۔ اُس نے اپنا داہنا ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالا اور ناخن سے اپنے پیٹ پر اندر ہی اندر لکیریں کھینچنے لگا۔ طوائف نے مسکرا کر کہا۔ ''بل دیجئے اِسے۔ چلا تو جائے۔''

وشومبر کا چہرہ کنپٹوں تک جل گیا۔ جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔ ''افسوس ہے میں بٹوہ بھول آیا۔''

طوائف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ بولی۔ ''پھر یوں ہی عشق کرنے آئے تھے۔ جیسے تمہاری ماں کا گھر ہے!''

وشومبر کچھ بھی نہ بول سکا۔ اُس کی جیب میں صرف ساڑھے نَو آنے باقی رہ گئے تھے اور ابھی ضروریات کی فہرست باقی تھی۔ مچلتے ہوئے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ پیاس بُجھ گئی۔ وہ اُٹھ کر دروازے کے قریب آیا اور بوٹ پہننے لگا۔

طوائف نے زہر خند کر کے کہا۔ ''یہ کس کا کوٹ پہن رکھا ہے جو بٹوہ ہی گھر پر بھول آئے؟''

وشومبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جلد جلد سیڑھیوں سے اُترا۔ گزشتہ واقعہ اُس کی آنکھوں میں دوبارہ پھر گیا۔ اُس نے دنیا کو اندھا سمجھ لیا تھا۔ لیکن اب اُسے معلوم ہوا، دنیا اندھی نہیں وہ خود اندھا ہے۔ مالک نے اُسے ایسا کوٹ دیا جس کی جیبیں پھٹی ہوئی تھی۔

وہ اب بازار سے گزر ہی نہ سکا۔ کاش اس کے پاس روپے ہوتے! وہ اپنے ارمان نکالتا۔ تصویریں خریدتا۔ روز پیتا اور......''

اب تک اُسے اپنا آپ ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اب کوٹ کے بوجھ سے اس کے شانے ٹوٹ سے گئے تھے۔

اسے معلوم ہوا مچھلیوں والے بازو، پرشور جوانیاں، مطمئن چہرے، خالص اونی کوٹ سب اس دُنیا کے سامنے فضول اور بے حقیقت ہیں۔ حقیقت صرف پیسہ ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب انسان کے قانون میں تنومندی کا احترام ہو۔

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا گھر جانے لگا۔ راستے میں کتنے ہی لوگ اوور کوٹ پہنے جا رہے تھے۔ لیکن اس وقت وشومبر کا دماغ موازنے کی لذّتوں سے اسے فریب نہیں دینا چاہتا تھا آنگن میں پہنچ کر کتا بھونکنے لگا، حالانکہ اسے معلوم تھا یہ مالک کا وشومبر ہے

لیکن پرایا کوٹ بدن پر دیکھ کر حیوان نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔

''ابھی اتارتا ہوں، بھئی! یہ میرا کوٹ نہیں، تمہارے ہی مالک کا کوٹ ہے،'' وشومبر نے جل بھن کر کتے سے کہا۔ کتا جیسے مفہوم سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

کمرے میں وشومبر نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ نہ اُس پر میلی چادر پھیلائی اور نہ لٹکانے سے پہلے جھاڑا۔ اتارتے اُتارتے اپنے ہی آپ سے کہنے لگا۔ دیوتا! یہ کوٹ واپس لے لو...... ہم لوگ ان چیزوں کو پہن کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ سرِ بازار بیٹھنے والی طوائف اور پالے ہوئے کتے تک کو اعتبار نہیں آتا کہ یہ میرا کوٹ ہے۔ ہم انسانیت کے بے پناہ جوہڑ کے مچھر ہیں جو گندگی ہی میں موٹے ہوتے ہیں اور زندہ بھی رہ سکتے ہیں ہماری بے رنگ وبو زندگیوں کے سکون کو اپنی دُنیا کی لذتوں سے آشنا کر کے فنا نہ کرو۔ ہم ابھی انسان نہیں......! ہم ابھی انسان نہیں!!



دنیا ہماری

کل بنک کے چوک میں، غلام رسول کی لانڈری کے قریب میری مایوس آنکھوں نے دنیا کی کئی تصویریں دیکھیں۔ ایک سے ایک حسین، ایک سے ایک جدا، ایک سے ایک مختلف۔

دو لڑکیاں فر کوٹ کی دھلائی کے متعلق غلام رسول سے باتیں کر رہی تھیں۔ ''دیکھنا کہیں فر خراب نہ ہو جائے۔''

''ڈرائی کلینگ سے بالوں کی سپیدی پر کوئی اثر نہ پڑے۔'' اور غلام رسول للچائی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں کو جن میں سے ایک کے شباب پر معصومیت اور شوخی، شعریت اور بے نیازی چھائی ہوئی تھی اور دوسری کے شباب پر سنجیدہ سوختگی اور متانت، بے زادی اور یاس! دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ ایک جیسے خدوخال، ایک جیسے نقش ونگار، ایک جیسی وضع قطع۔ صرف شباب کی شراب میں ایک زیادہ مخمور تھی اور دوسری کا خمار اُتار پر تھا۔ شاید ایک زندگی کے اس موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں سے رنگین دنیا شروع ہوتی ہے اور دوسری...... وہ کچھ فاصلہ طے کر چکی تھی۔ ایک ضرورت سے زیادہ خوش تھی اور دوسری ضرورت سے زیادہ سنجیدہ! شاید اس کا شباب خراج حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

''کب تیار ہوگا کوٹ؟'' کھلنڈری جوانی کی مالکہ نے اپنی آنکھوں کو ایک عجیب

انداز میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

''بس پرسوں ...... پرسوں مس صاحبہ! میرا وعدہ پکا ہوتا ہے۔'' غلام رسول نے جلدی جلدی کہا۔

پکے کے لفظ پر دونوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔ شاید اُنہیں اعتبار نہ آیا کہ کوئی کشمیری بھی اپنے وعدے کا پکا ہوتا ہے۔ اور غلام رسول ایک معمولی لانڈری کا مالک، جو شروع شروع میں امیرا کدل کے امیروں کے کپڑے دھوتا تھا اور عام محنتی دھوبیوں کی طرح کمر پر گٹھڑی اُٹھائے پھرتا تھا۔ وہ وعدے کا پکا کیونکر ہوسکتا ہے؟ وہ وعدے کا پکا ہوتا تو آج لانڈری کا مالک نہ ہوتا۔ عام جذباتی دھوبی ہوتا۔ گاہکوں کے سفید کپڑے پہنے ہوئے اُجلا اُجلا سا دکھائی دینے والا۔ لیکن زندگی نام ہے جدوجہد کا۔ شاید اسی لئے وہ دھوبی سے لانڈی کا مالک بن گیا۔ نہ جانے جدوجہد کا دوسرا قدم اسے کہاں پہنچا دے۔ سردست وہ اپنی زندگی کا ایک حسین خواب دیکھ رہا ہے۔ جہاں چوک میں لانڈری ہے۔ اور لانڈری کے برآمدے میں دو حسین و جمیل لڑکیاں ایک زندگی کے رومانی موڑ پر پہنچی ہوئی۔ دوسری مُڑ مڑ کر طے کئے ہوئے فاصلے کو حسرت سے دیکھتی ہوئی۔

غلام رسول بار بار اپنے سیاہ اور حریص ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ ذرا قابو میں رہیں۔ اور سنہرا سپنا دراز سے دراز تر ہو جائے۔ لیکن اندر کا سانپ اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس کے روئیں روئیں سے باہر جھانک رہا ہے۔ مدھور شہنائی پر جو دو لڑکوں کے شباب اور حسن سے سر بازار بج رہی ہے۔ کتنا فریب خوردہ ہے۔ حسین نظروں کے رقص پر، حسین قہقہوں کے نغمے پر لہرا رہا ہے۔ حالانکہ اُسے علم ہے کہ یہ لے یہ ترنم اور یہ ہوشربا نغمہ اس کی رسائی سے کہیں دور ہے۔ لیکن پھر بھی جھوم رہا ہے۔ اگر بے زبانوں نے بھی آدم کے بیٹے کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہوتی۔ تہذیبیں بنا بنا کر مٹائی ہوتیں۔ تو شاید

اندر کا سانپ اتنا فریب خوردہ نہ ہوتا۔ وہ آدم اور حوا کی پیدائش سے فریب کھاتا آ رہا ہے۔ فریب کھاتا جا رہا ہے۔ اور شائد آئندہ بھی فریب کھاتا ہی جائے گا۔ اس کے نزدیک رسائی اور نارسائی کا سوال نہیں۔ اُسے حُسن چاہئے اور موسیقی، نغمہ چاہئے اور ترنم! اور غلام رسول وعدے کا پکا ہے......!

ایک بھکارن ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ اس کا معصوم بچہ باسی روٹی کا ٹکڑا کھا رہا ہے۔ غلام رسول کا سنہرا خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

''خدا کے نام پر ایک پیسہ!''

اگر چہ بھکارن کو معلوم نہیں۔ خدا کون ہے۔ کہاں ہے، کیسا ہے! پھر بھی اُسی کا واسطہ دے کر وہ لوگوں کے جذبات پر دستک دیتی ہے۔ نادیدہ کا واسطہ۔ بے پروا کا واسطہ۔ پردہ نشین کا واسطہ۔ ''خدا کے نام پر ایک پیسہ!''

لیکن کیوں ری بھکارن۔ کہاں ہے تمہارا خدا؟ جوانیوں کے نام پر حُسن کے نام پر، شوخی کے نام پر، ترقی کے نام پر کیوں پیسہ نہیں مانگتی؟ ذلیل عورت! جبھی تو خاک چھانتی پھرتی ہے کہ تجھے صرف جذبات سے کھیلنا آتا ہے۔ محسوسات سے نہیں۔

''دور ہٹ! بے حیا نہیں دیکھتی کون کھڑی ہیں؟'' غلام رسول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

بچہ پھر بھی مطمئن ہے۔ ماں دھتکاری جا رہی ہے۔ اور بچہ مزے سے روٹی کا ٹکڑا کھا رہا ہے۔ کیا ہوا......؟ کچھ بھی تو نہیں! جذبات سے کھیلنے والوں کا، نادیدہ کا واسطہ دینے والوں کا اندر کا سانپ زمانے کی لاٹھی نے مار دیا ہے۔ زندہ ہوتا تو شاید پھنکار اُٹھتا۔ ڈسنے کے لئے اپنی پتلی سی زبان باہر نکالتا۔ لیکن وہ مر چکا ہے۔ مارا گیا ہے ہمیشہ کے لئے۔ اور اس کا کسی کو افسوس نہیں۔ نہ بھکارن کو، نہ بچے کو۔ نہ حُسین و جمیل لڑکیوں کو اور نہ غلام رسول

کو۔

بھکارن نے آنکھیں پھیلا کر اپنے سامنے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھا۔ ننگی باہیں، اُبھرے ہوئے سینے، بوجھل بوجھل سی نرگسی آنکھیں، مرمریں چہرے، بالوں کی لٹیں کھلی اور پریشان...... وہ انہیں دیکھ کر نہ مرعوب ہوئی نہ شرمسار!

''خدا کے نام پر ایک پیسہ!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور بچہ روٹی کا ٹکڑا ختم کر کے شوخ وشنگ لڑکی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

اُجلے اور چرچرے شلوار پر میلے ہاتھوں کے نشان لگ گئے۔

''دور...... دور ہو جا......'' لڑکی نے ڈر کر، سہم کر اور ذرا پھلانگ کر کہا۔ اور پھر تاسف، غصے اور حقارت بھری نظروں سے پہلے اپنی شلوار کو دیکھا۔ پھر اس کم بخت بچے کی طرف! جواب بھی مطمئن تھا۔ البتہ اسکی ماں بے چین ہو اُٹھی تھی۔ اور بے چینی ہی میں اس نے بچے کے گال پر تھپڑ بھی دے مارا۔ ''پیسہ مانگ اِن سے......'' ماں نے بچے سے کہا۔

بچے کو تھپڑ کا کوئی احساس باقی نہ رہا۔ کیا ہوا......؟ کچھ بھی تو نہیں! اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ایک پیسہ...... مائی......''

دونوں لڑکیاں اور غلام رسول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ''مائی کیسی مائی؟

شاید بچے کو علم نہ تھا۔ کہ ہر عورت بھک منگے کی مائی نہیں ہوتی۔

اور اُس کی ماں التجا بھری نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔ خصوصاً اُن دو لڑکیوں کو جن کے ہونٹوں پر افق اور شفق کھیل رہی تھی۔

بھکارن کیا دیکھ رہی ہے؟ اپنی ہی ذات، اپنی ہی نسائیت اپنا ہی عکس دیکھ رہی ہے۔ ایک بہناپہ سا، ایک رشتہ سا، ایک یگانگت سی، جو حوا نے دودھ کے ساتھ اپنی اولاد کو بخش دی تھی...... بے وقوف عورت! حوا کو کیا معلوم تھا۔ جب ننگے آدم کی اولاد غاروں سے

نکل کر شہروں میں بسے گی۔ سماج بنائے گی۔ تہذیب کی طرح ڈالے گی۔ تجارت کرے گی۔ اس وقت وہ مقدس امانت جو تمہارے خیال کے مطابق سینہ بہ سینہ چلی آنی چاہئے تھی۔ ختم ہو جائے گی۔ اور ایک ہی زمین پر رہنے والے آدم کے بیٹے کئی لکیریں کھینچیں گے۔ کچھ سیدھی۔ کچھ ٹیڑھی، کچھ متوازی اور کچھ ناقابل فہم سی! ایک لکیر کی قید میں بھک منگے ہوں گے۔ اور دوسری لکیر کی قید میں شوخ وشنگ لڑکیاں۔ تیسری لکیر میں غلام رسول۔ چوتھی لکیر میں غلام رسول کا ہمسایہ دکان دار۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔ شکر ہے آج حوا ہے نہ آدم! غریب پاگل ہو کر سمندر کی گہرائیوں میں ناچتے!

جا بے وقوف عورت! کیا دیکھ رہی ہے تو؟ کیسے پہچان رہی ہے تو؟ ...... جا جذبات سے کھیل اور بھیک مانگ!

لڑکیاں چلی گئیں۔ نغمہ ختم ہو گیا۔ اور غلام رسول کے اندر کا سانپ اپنے بل میں جانے لگا۔ بھکارن اسی طرح کھڑی دیکھتی رہی کہ کوئی لکیر پھاند کر اس کی جھولی بھر دے۔ لیکن کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟

بھکارن نہ زیادہ خوبصورت تھی نہ زیادہ بدصورت۔ بس خوبصورتی اور بدصورتی کو آپس میں ملا دینے والی حد پر کھڑی تھی۔ عمر بھی یہی تیس پتیس کی تھی۔ بھیک نے اُس کا نسوانی غرور چھین لیا تھا۔ اب صرف التجا بن کر رہ گئی تھی۔

غلام رسول جب فرکوٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر باہر نکلا۔ تو بھکارن اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے پھر اپنی زبان حریص ہونٹوں پر پھیرنا چاہی۔ لیکن کیوں؟ اب حرص کو قابو میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سانپ پھر لہرانے لگا، لیکن ہولے ہولے۔ ایک پھن پھیلائے ہوئے کوبرا کی طرح!

"ایک بات مانو گی......؟" غلام رسول نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''کہہ دو......''

(ہنس کر) ''میرا مطلب ہے......تم رات کو کہاں رہتی ہو؟''

''یہیں پار...... مسجد کے تھڑے پر۔''

''......تو آج رات...... یہاں نہ رہ سکو گی......میری لانڈری میں۔''

بھارن کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔

غلام رسول اس کے سامنے وحشیانہ قہقہے لگانے لگا۔

بھکارن نے بچے کو اُنگلی سے تھاما۔ اور اسی طرح اُسی جوش میں برآمد سے سے نیچے اُتری۔

''مالزادی......چڑیل ......'' غلام رسول نے قہقہہ لگا کر سڑک پر جانے والی بھکارن سے کہا۔

بھکارن نے خاموشی میں گالی کھائی۔ اس کا سانپ زندہ ہوگا۔ تو شاید وہ بھی لہرا اُٹھتا۔ البتہ اُس کی طبیعت طول ہو گئی۔ کیوں؟

گالی کیا بُری ہے؟ اور بچے کی بھیک مانگنے والی ماں......لوٹ
آ......تم جیسی لکیر کا ایک قیدی تمہاری جھولی بھر دے گا......
آ......آج کی رات اُس کی لانڈری میں بسر کر! اور پھر صبح چلی جا اس وسیع دنیا میں، بے پرواخدائی کا واسطہ دیتے ہوئے!

آ......آ......آ بے وقوف بھکارن۔ سانپ لہرا رہا ہے!

لیکن ناسمجھ بھکارن چلی گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں......ہوا کی لہروں نے نہ جانے گالی کو کہاں دے پٹکا۔ ہنگامہ ہوتا۔ تو غلام رسول کا ہمسایہ دکاندار پتلون میں ہاتھ ڈالے باہر نہ نکلتا۔

غلام رسول قہقہے لگا کر۔ بھکارن کو سیٹیوں سے بُلا کر جب نا اُمید ہو گیا۔ تو شکستہ کُرسی پر بیٹھ گیا۔

اور سامنے سے دو موٹے موٹے انسان اپنے سرمایہ کے نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے لگاتے گزرے۔

''کاش یہ جنگ دو سال تک ابھی بند نہ ہوتی ......'' ایک نے کہا۔ اور دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ پھر دونوں سامنے بنک میں داخل ہو گئے۔



کیا یہی ہے دنیا ہماری؟ اور یہی ہے اس کا اُصول؟ سانپوں کا لہراؤ۔ گالیاں کھاؤ۔ حساب و کتاب رکھو۔ ٹکراؤ۔ لیکن چلے چلو! چلے چلو!!

☆☆☆

سہارا

خزاں کے موسم میں جب کبھی مطلع اَبر آلود ہو جاتا ہے۔ تو باغوں پر بھی ایک کیفیت سی چھا جاتی ہے۔ ہلکی اور میٹھی دھوپ میں پھیلا ہوا جوش کہیں کہیں یکلخت ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں کسی کے دل میں زیادہ اُبھر آتا ہے۔ آج بھی آسمان اَبر آلود تھا۔ لیکن مایوس فضا اور مکدر ماحول کو دیکھتے ہوئے بھی محکمہ آثار قدیمہ کے تواریخی باغ میں کچھ نوجوان عورتیں مورنیوں کی طرح مسرت میں جھوم رہی تھیں۔ وہ سڑک کے کناروں سے اور باغ میں چنار کے جھڑے ہوئے زرد اور لال لال پتے بڑے انہماک سے جمع کر رہی تھیں۔ کبھی سوکھے ہوئے سبزے پر لوٹتی تھیں اور کبھی زور سے قہقہہ مارتی تھیں۔ اس وقت تک جب کہ پاس کی چھاؤنی سے تین بجے کے بگل ابھی ابھی بج کر خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے باغ کے وسط میں پتوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر جمع کیا ہوا تھا۔ ہنگامِ مسرت کے ساتھ ساتھ اُن کی نگاہوں میں خوف بھی جھلک رہا تھا۔ کہیں محکمہ آثار قدیمہ کا کوئی ملازم انہیں پتے جمع کرنے سے نہ روکے۔ یا چھاؤنی کا کوئی سپاہی سڑک کے کنارے جھڑے جھڑے ہوئے پتے جمع کرنے پر بُرا بھلا نہ کہے۔ وہ ہر سال اسی طرح مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر پتے جمع کیا کرتی تھیں۔ اور انہیں ٹوکریوں میں بھر کر خوشی خوشی گھر لے جاتی تھیں۔ اس مشقت سے جو محض عارضی اور کسی حد تک تفریحی بھی تھی۔ اُن کے مالک زمستان کے

ایک ضروری مصرف سے بے نیاز ہوجاتے تھے۔

اور آج بادل چھائے ہوئے تھے۔ جانے کس وقت آسمان سے پانی برسنا شروع ہوجائے اور محسن درختوں سے جھڑی ہوئی دولت بہہ کر ضائع ہوجائے۔ اور پھر اس موسم کے بعد زمستان...... کڑاکے کی سردی...... برف...... سبھی کچھ! جب پھرن کے نیچے شعلوں سے دہکتی ہوئی کانگڑی ہر کشمیری کی روح بن جاتی ہے۔

باغ کے کونے میں ایک نوجوان دایہ دستی گاڑی میں بچے کو سلا کر سوکھی گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بے ترتیبی میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ذہنی پریشانیوں کے سبب انتشار سا پھیلا ہوا تھا۔ باغ میں وہ روزانہ آتی تھی۔ لیکن اس سے قبل وہ کبھی اس طرح من کو مار کر نہ بیٹھی تھی۔ اور نہ شاید اس سے اس طرح بیٹھا جاتا تھا۔ کچھ نہیں تو سوکھے پودوں ہی سے کھیلتی تھی۔ کچھ گنگنا ہی لیتی تھی۔ کسی کم سن سے بات چیت ہی کرتی تھی لیکن آج...... آج وہ خاموش تھی اور پریشان سی اور باغ میں کچھ نوجوان عورتیں مورنیوں کی طرح مسرت میں جھوم رہی تھیں۔ وہ پولوگراؤنڈ کے قریب، کلب روڈ پر، کمپنی باغ میں لاتعداد کشمیری عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو تنکے، درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اور سڑک پر بکھری ہوئی پتیاں جمع کرتے دیکھتی تھی۔ اور کسی حد تک ان سے مانوس بھی ہوچکی تھی۔ اگرچہ اُن کی معاشی زندگی سے اسے نفرت سی تھی۔ اور اپنے دل میں کبھی کبھی سوچتی تھی "اتنی میلی کچیلی عورتیں زندہ کیونکر رہتی ہیں۔" لیکن آج باغ میں پتے جمع کرنے والی عورتوں کو دیکھ کر اُس کی نفرت نمایاں نہ ہوئی اور نہ اُس کے دل نے سوال کیا۔ "اتنی میلی کچیلی عورتیں زندہ کیوں کر رہتی ہیں۔"

اُس کی پُر ملال اور منتشر نگاہوں نے انہیں دیکھا۔ صرف دیکھا اور کانوں نے کبھی کبھی اُن کے قہقہے کی آواز سنی!

''اُف''......اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔لیکن جلد ہی اس نے سنا''خدا بچائے۔ہم دواؤں پر بچوں کو نہیں پالتیں۔جتنا دودھ چھاتیوں سے نکلے۔انہیں پلاتی ہیں یا کلچہ،ستو،شیریں چائے،بھتہ،تمہارا 'کلم' نہیں۔''

''اور مکھن بھی نہیں؟''نصیرن نے حیران ہو کر پوچھا۔

ایک عورت نے ہنس کر کہا۔''یہاں یہ چیزیں بیماروں کو دیتے ہیں۔بچوں کو نہیں۔''

تینوں عورتیں پتوں کے ڈھیر کی طرف جانے لگیں اور نصیرن بھی گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اسی طرف نکل گئی۔چلتے چلتے ایک عورت نے پوچھا۔''تمہاری میم کے کتنے بچے ہیں؟''

نصیرن نے جو کسی اور سوچ میں ڈوب گئی تھی۔چونکہ کر کہا۔''صرف یہی ایک! ایک میرا ننھا......بابا؟''

دوسری عورت نے جلد جلد سوال کیا۔''کتنے برس ہوئے اسے شادی کیے ہوئے؟''

گاڑی آہستہ آہستہ چلنے کی حرکت سے بچہ جاگ اُٹھا تھا۔نصیرن نے گاڑی روک کر اس کے بدن سے اونی رومال اُٹھالیا۔اور مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔'' سات برس''تینوں عورتوں نے اپنی اُنگلیاں دانتوں تلے دبائیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔نگاہوں ہی نگاہوں میں استعجاب پھرنے لگا۔سات برس میں ایک بچہ! اُنکی شادی کو صرف پانچ برس گزرے ہوئے ہوں گے اور ان کے گھروں میں تین تین بچے کھیل رہے تھے اور میم کے ہاں سات برس میں صرف ایک بچہ!

''دراصل یہ لوگ......''ان میں سیانی عورت نے سنجیدگی سے اور دو عورتوں کو کچھ کہنا چاہا تھا لیکن کہا نہیں۔

نصیرین بچے کو گود میں اُٹھا کر خوب ہنس دی۔ کل دو پہر اس وقت تک اُس نے شاید پہلی بار کُھلے دل سے ہنسا اور وہ بھی تین چار بچوں کی ماں کی فلسفیانہ بات سُن کر! تینوں عورتیں بچے کو غور سے دیکھنے لگیں، جو میم کی سات برسی کی شادی کا نچوڑ تھا۔

''کتنا موٹا بچہ ہے۔'' ایک عورت نے جاتے جاتے دوسری سے کہا۔ ''تین برس سے کیا کم عمر ہو گی؟''

نصیرن نے گاڑی میں بچے کو لٹا کر گاڑی پھاٹک کی طرف موڑ لی۔ اور واپس جانے لگی۔ اسے میلی کچیلی کشمیری عورتوں سے نفرت کی جگہ اُنس سا ہونے لگا۔ جو کسی حال میں اُس سے عمر میں زیادہ نہ تھیں۔

ہاں یہ ضرور تھا کہ محبت کے بے اعتدالیوں اور پست حالی کے سبب اُن کی زندگی میں ساز کے شکستہ تاروں کی طرح اُلجھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس میں دلکش نغمے کی آواز گونج رہی تھی۔ جس کی لے نے انہیں بالکل مطمئن بے پروا اور قانع بنا رکھا تھا۔ اسکی وجہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مردوں کے پہلوؤں میں لمحے گزار رہی تھیں۔ اُن کے ڈھیلے ڈھیلے بدن کے نیچے مضبوط اور تنومند سہارے آ چکے تھے۔

وہ اسی خیال میں جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ پُل کے پار کچی اینٹوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کی طرف تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اُسی طرح بے پروائی میں مسکراتی۔ ایک دوسری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ قہقہے مارتی ہوئی۔

نصیرن نے تھوڑی دیر کے لئے سڑک کے وسط میں اپنے قدم روک لئے اور اور اُن عورتوں کو جو ابھی ابھی اُس سے باتیں کر کے چلی گئی تھیں، دیکھنے لگی۔ نو جوان عورتوں کی مسرت کے سائے تلے اُس پر دیوانگی سی چھا گئی۔ ایک عجیب کیفیت۔! اُسے بچے تک کا خیال نہ رہا۔ جو نیلی نیلی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

کاش......کاش! میرا بھی گھر ہوتا ایسا ہی۔ کچی اینٹوں کا بنا ہوا۔ بید کے درختوں میں گھرا ہوا۔ جہاں ہر وقت، ہر طرف محبت ہی محبت چھائی رہتی۔ جس سے افلاس کی گرانباری محسوس نہ ہوتی۔ جہاں پھٹے ہوئے پاؤں۔ ٹکتی ہوئی چھاتیوں اور پیوند کیے ہوئے کپڑوں کی تنگ و ناموس نیلی نیلی آنکھوں میں کبھی بھی نراشا بن کر نہ جھلکتی......کاش......

کاش میرا بھی ایسا ہی گھر ہوتا!

وہ اِسی سوچ میں آگے بڑھنے لگی۔ اُس کی نگاہوں کو اب سہارے کی جستجو تھی۔ جو اُس کے شباب کو اُٹھائے اُسے اپنے اُوپر لئے پھرتا۔ راستے میں آنے جانے والے کتنے ہی فوجی سپاہیوں اور راہروں کو اُس نے دیکھا۔ اُس میں کچھ نوجوان تھے اور کچھ جوانی سے پرے پہنچے ہوئے......لیکن،......نہیں......نہیں۔ نصیرن کی آگ کو آگ کی ضرورت تھی۔ اُس کے گرم لہو کو گرم لہو کی ضرورت تھی اور وہ راہ چلتے جوان...... وہ صرف ہنگامی اور غیرارادی جذبات سے متاثر ہو کر اُسے دیکھتے تھے۔ حقیقی آگ کی تپش محسوس کرتے ہوئے نہیں اور ایسی آگ سے کھیلنا......وہ نہیں چاہتی تھی......وہ اسی خیال میں پھاٹک میں داخل ہوئی۔

نوبت خان رسوئی خانے کے باہر شکستہ بنچ پر پیاز چھیل رہا تھا۔ نصیرن کو دیکھتے ہی اُس کی بھویں تن گئیں۔ نصیرن نے بچے کو مالکن کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے کمرے میں جانے کے عوض رسوئی خانے کے دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ سے بولی۔ ''شوربہ ہے؟''

نوبت خان نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ نصیرن سچ مچ شوربہ مانگ رہی ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ نصیرن کا ظاہری وجود شوربہ ایسی مقوی غذا مانگ رہی ہے۔ لیکن باطنی وجود، اصلی نصیرن کی نگاہیں اُس سے کچھ اور طلب کر رہی

تھیں۔ جس وہ زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ اپنے ہونٹ زور سے بند کئے اور دل ہی دل میں نادم بھی ہوئی...... وہ اگرچہ زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ یا کم از کم ایسی نہ تھی، جسے حُسن کا کوئی معیار ......ادنیٰ ہی سہی قرار دیا جائے لیکن اُس کے نقش ونگار میں غیر معمولی کشش سی تھی۔ وہ کشش جو بعض اوقات سرراہ ترتیب میں آنے جانے والے فوجی سپاہیوں کے دلوں میں وقتی جذبات اُبھارنے میں کامیاب ہوتی تھی ...... یا اُس کے خانساماں کو اُس کی طرف بسا اوقات متوجہ کرتی تھی۔ لیکن اِس کشش سے بھی وہ واقف نہ تھی۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک فرنگی عورت کی نوکرانی ہے۔ جس کا کام اُس کے بچے کو تازہ ہوا کھلانا ہے۔ صابن کی مرمریں جھاگ سے نہلانا ہے۔ وقت وقت پر کلم اور گلیکسو کھلانا ہے۔ مکھن اور شوربہ پلانا ہے۔ اسے گاڑی میں لٹا کر کلب روڈ، ہوٹل روڈ اور چھاؤنی کی طرف گھومنا ہے اور شام کے وقت بچے کو سلا کر اپنے کمرے میں......؟

کبھی کبھی جب وہ شدت احساس سے مجبور ہوتی۔ دل کے پوشیدہ کونے میں اپنی اور مالکن کی زندگی کا موازنہ کرتی۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا اُس وقت آندھی کی طرح اُس کے جذبات میں طوفان اُٹھتا۔ اور گرد وغبار کی طرح وہ اسی آندھی میں بہت دور جا لگتی۔ حتیٰ کہ طوفان تھم جاتا اور اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ ایسے وقتوں میں صرف اُس کا دماغ ہی زبان اور آنکھوں کا کام کرتا۔ اور اُس کا ظاہری بدن اس موازنے کے ہنگامے سے نا آشنا رہتا۔ ’’آخر مجھ میں اور مالکن میں کتنا فرق ہے۔ وہ انار کے دانے کی طرح لال اور میں...... میں نصیرن! لیکن دونوں عورتیں ہی تو ہیں۔ اور یہ پتے جمع کرنے والی کشمیری عورتیں! یہ بھی تو ہماری ہی سطح پر کھڑی ہیں۔ اگر سبھی عورتیں روزانہ مکھن، شوربہ اور برانڈی پینے کی عادی ہوں۔ تو سب کی ٹانگیں سڈول، چھاتیاں پتیل کے گیند کی طرح سخت اور بال ریشم کی طرح نرم ونازک ہوں گے اور رنگ ٹماٹر سے زیادہ سرخ، شعلے سے زیادہ خوبصورت

اور جاذب نظر! لیکن ہم میں دال اور چاول کھانے کے عادی جس سے گردن کا گوشت بھی لٹک جاتا ہے۔''

اُس نے ایک دن خانساماں سے پوچھا۔ ''ہم تم شوربہ کیوں نہیں پیتے خان؟''

خانساماں اُس وقت نصرین کے فلسفے کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا۔ غیر ارادی طور پر بولا۔ ''شوق سے، شوق سے!'' اور پھر زور سے مسکرایا۔

نصرین کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اب شوربہ پئے گی۔ کیک کھائے گی۔ اور اگر جی چاہے تو برانڈی بھی...... پھر مالکن اور اُس میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

لیکن کل عجیب بات ہوئی۔ وہ شوربہ پی چکی تو خانساماں نے اپنا مضبوط ہاتھ اُس کے داہنے گال پر پھرا۔ اور آہستہ سے ہنس دیا۔

نصریں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ چہرے پر ہلدی سی پھیل گئی۔ اُس نے حیرت بھری نظروں سے خانساماں کی طرف دیکھا۔ جس کے ہونٹ مسکراہٹ کے بعد اب تک تھرتھرا رہے تھے۔

خانساماں نے دوبارہ اپنا ہاتھ اُس کے گال پر پھیرنا چاہا۔ تو نصرین مضبوطی سے بولی...... ''کمینے...... پاپی......''

نوبت خان کئی انگریزوں کے پاس رہ چکا تھا۔ اُس نے نصرین جیسی کئی نوکرانیاں دیکھی اور آزمائی تھیں۔

مُسکراتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ ''خفا ہوگئیں؟''

نصرین نے شوربے کا خالی گلاس دور پھینکتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اسی لئے شوربہ پلاتے رہے کہ میں تمہاری گالی برداشت کرسکوں......''

نوبت خان کو نصرین کا غصہ بالکل بے حقیقت دکھائی دیا۔ وہ خود بھی نوجوان تھا۔

لیکن جہاں دیدہ!

گالی کا لفظ سُن کر وہ زور سے ہنس پڑا۔ بولا۔ ''خدا کی قسم! تم مزے کی لڑکی ہو نصریں! معمولی بات پر بہت زیادہ چڑ گئی۔ ہاہاہا...... گالی؟''

نصرین کچھ بھی نہ بول سکی۔ لفظوں کی جگہ اُس کے منہ میں دھواں سا جمع ہو گیا اور آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پھوٹ پڑے۔

نوبت خان اُس کے قریب آ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''تم لاکھ برا مناؤ۔ لیکن ایک دن تمہیں کسی کی گالی برداشت کرنی پڑے گی۔ تمہارا شباب تمہارے خدوخال، آنکھیں خود گالی کے لئے آوارہ ہونگی......اور......آج۔''

نصرین نے نوبت خان کی بات خاموشی سے سنی۔ لیکن غصے میں اُن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ مالکن کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے بھی کسی قدر کمزور اور بے بس ہے۔ نوبت خان کے چہرے سے سنجیدگی غائب ہو گئی اور مسکراہٹ پھیل گئی۔

نصرین چپکے سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے دل پر، اُس کے گھٹنوں پر، اُس کے پپوٹوں پر کسی نے من من بھر کے پتھر، سرد اور بے مہر رکھ دئے ہوں۔ اُسے ساری کوٹھی بجھی ہوئی بھٹی سی دکھائی دی۔ جہاں اس کے لئے کہیں بھی شفقت یا ہمدردی کی گرمی نہ تھی۔

صحن میں بھنگی کوڑے کرکٹ کا ٹوکرا لئے باہر جا رہا تھا۔ نصرین کو دیکھتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلا کر اُس نے کہا۔ ''سلام ہے بُوا۔''

نصرین نے بادل ناخواستہ اُس کی طرف دیکھا اور بھنگی نے پاس آ کر کہا۔ ''اپنے قدموں کی خیرات نہ ملے گی اب......''

بھنگی کئی دن سے اپنی جوان بیٹی کے لئے نصرین سے پُرانی دھوتی مانگ رہا تھا۔ آج نصرین کو رسوئی خانے سے نکلتے دیکھ کر اُسے اپنی بیٹی یاد آئی۔ جس کی شلوار رانوں پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور خوف ندامت سے وہ باہر نہ نکل سکتی تھی۔

نصرین کا جواب نہ پا کر بھنگی نے عاجزی سے کہا۔ ''اُس کی ٹانگیں، رانیں ننگی ہو رہی ہیں۔ وہ باہر نکل ہی نہیں سکتی...... کہیں کوئی لفنگا اُسے گالی نہ دے ...... اسی لئے......'' نصرین نے بھنگی کی بیٹی نہ دیکھی تھی اور آج تک ہر روز بھنگی صرف قدموں کی خیرات مانگ رہا تھا۔ لیکن اب گالی کا لفظ سن کر اس کے دل میں بھنگی کی بیٹی کے لئے ہمدردی سی پیدا ہوگئی۔

''وہ ننگی ہو جائے گی اور پھر گالی......'' اُس نے دل میں سوچا۔ ''کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہوئے بھی جب خانساماں مجھے گالی دے سکا تو اسے کون گالی نہ دے سکے گا۔'' وہ جلد جلد اپنے کمرے میں چلی گئی اور کھونٹی پر لٹکتی ہوئی دھوتی جو اس نے گزشتہ مہینے ہی سے استعمال کی تھی۔ بھنگی کی طرف پھینک دی۔

بھنگی اُس کی جان اور اُس کے بچوں کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ حالانکہ نصیرن کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اسے شک ہوا۔ بھنگی نے جان بوجھ کر اسے گالی نہ دی ہو۔ وہ درواز سے پر کھڑی ہوگئی۔ لیکن بھنگی پھاٹک سے باہر نکل چکا تھا۔ نصرین کی خیرات نے اس کے قدموں میں سبک رفتاری پیدا کر دی تھی۔ اور وہ اپنی بیٹی کو کسی لفنگے کی گالی سے بچانے کے لئے قدم پر قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔

وہ کمرے میں بے تاب سی ہو اٹھی۔ خانساماں کی گالی اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کی خطرناک پیشین گوئی بھی۔ ''نصرین ایک دن تمہیں کسی کی گالی برداشت کرنی پڑے گی۔ تمہارا شباب تمہارے خدوخال، تمہاری آنکھیں خود گالی کے لئے

آوارہ ہونگی" اس کے جذبات میں جوار بھاٹا آ گیا تھا۔ اگر آج صاحب موجود ہوتا تو وہ اُسے صاف صاف کہہ دیتی کہ خانساماں نے اس کی شرم وحیا پر حملہ کیا۔ لیکن وہ لام پر گیا ہوا تھا۔ اور میم صاحبہ سے شکایت کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ وہ معمولی باتوں پر اسے جھاڑ دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے نصرین سے پیار بھی تھا۔

اُس نے سر درد کا بہانہ کر کے بچے کو سیر کے لئے نہ نکالا۔ اپنی کوٹھڑی میں رضائی کے نیچے سر چھپا کر لیٹ گئی۔

ایک بار مالکن خود اس کے کمرے کے دروازے پر آ گئی۔ نصرین کو رضائی کے نیچے لیٹا دیکھ کر بولی "نصرین"۔

نصیرن اُٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولی۔ "حضور آج سر میں درد ہے۔ بہت درد ہے۔ آج باہر نہ جاسکوں گی......اور......"

میم کو اس کے بکھرے ہوئے بال، پسینے سے شرابور پیشانی اور ڈھیلا ڈھیلا بدن دیکھ کر اُس کے سر درد کا یقین ہو گیا۔ بولی۔ "ڈاکٹر بلاؤں؟"

نصرین نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں حضور! صبح تک ٹھیک ہو جاؤنگی۔"

میم نے اپنی نیلی آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا۔ "اوہ......ڈاکٹر نہیں۔ اچھی بات ہے روٹی مت کھاؤ......شوربہ پیو......"

شوربے کا نام سن کر نصیرن کی ملول آنکھوں میں دوبارہ خوف سا چھا گیا۔ اسی چیز نے خانساماں میں اُسے گالی دینے کی ہمت پیدا کی تھی۔ اُس نے جلد جلد کہا۔ "شوربہ نہیں حضور! فاسٹ کروں گی۔"

میم نے جاتے جاتے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ لیکن بے بی سے چھونا مت! اچھا۔"

مالکن کے منع کرنے نے نصرین کے دل میں ہلکی سہی خراش پیدا کی۔ وہ "بابا" پر

جان دیتی تھی۔ لیکن سر درد میں اُسے چھونے کی ممانعت تھی۔ اس لئے کہ اُس کی خدمات مستعار اور اُس کی محبت غیر ارادی تھی!

لیکن نصرین اُس سے غیر ارادی محبت نہ کرتی تھی۔ اُسے اگرچہ معلوم نہ تھا کہ محبت کی انتہا کیسی ہوتی ہے اور آغاز کیسا۔ لیکن جس طریق پر وہ بچے کو چاہتی تھی۔ کیا وہ محبت نہ تھی...... وہ ہلکے سروں میں گا گا کر اُسے نہلاتی تھی۔ مسکرا کر اُس کے مکھن جیسے ملائم بدن پر پوڈر ملتی تھی۔ صبح اور شام اسے کلم اور گلیکسو کھلاتی تھی۔ کیا یہ محبت نہیں؟

اور صبح سے شام تک جب اُس نے اپنے ''بابا'' کو نہیں دیکھا تو وہ بے چین ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکلی۔ مالکن کے کمرے کے باہر ہیٹ سٹینڈ پر فوجی ٹوپی آویزاں تھی۔ ہو بہو ایسی ہی ٹوپی اُس کا صاحب بھی پہنتا تھا۔ لیکن وہ تو لام پر گیا ہوا تھا۔ اور ٹوپی پر ویسے ہی پیتل کے بلے لگے ہوئے تھے۔ جو دہلیز کے بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹوپی اُتاری۔ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر وہیں رکھ دی۔

اندر کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ حتیٰ کہ دروازے پر لٹکتے ہوئے ریشمی پردے میں بھی کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ اور پرے رسوئی خانے میں شاید نوبت خان شوربہ پکا رہا تھا۔ نصرین نے آہستہ سے پردہ ہٹایا اور ایک قدم اندر داخل ہوئی۔ معاً دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر جلد جلد باہر نکلی۔ اور دہلیز کی سیڑھیوں کو پھاندتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی۔ اُس کا سانس پھول چکا تھا۔ آنکھیں حیرانی کے سبب بہت بڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی رضائی پر بیٹھ گئی۔ آج اُس کی آنکھوں نے عورت کی صحیح تصویر دیکھی تھی۔

اُسے اب نوبت خان کی گالی کچھ کچھ ہلکی دکھائی دینے لگی۔ اُسے محسوس ہونے لگا۔ عورت دنیا میں صرف گالی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ خواہ وہ مالکن کی حیثیت میں ہو یا

نوکرانی کی حیثیت میں۔ اسی لئے عورت محتاج بھی ہے۔ اور کبھی کبھی آوارہ بھی ہو جاتی ہے۔

رات کو اُس نے کچھ بھی نہ کھایا۔ اُسے اپنا ''بابا'' تک یاد نہ رہا۔ آج کا دن اُس کی زندگی میں اہم ترین دن تھا۔ اور آج کی رات طویل ترین! انہی چند گھنٹوں نے اُسے بہت نازک بات سمجھا دی تھی۔ جو آج سے بہت پہلے شوربہ پی پی کر بھی وہ نہ سمجھ سکی تھی۔

''شوربہ بھی کتنی مقوی غذا ہے۔'' اُس نے سوچا۔ ''لیکن ہم ہندوستانی لڑکیوں کے لئے نہیں۔ ہمارے لئے دال اور چاول ہی اچھے ہیں۔ جسے کھا کر کوئی گالی نہیں دے سکتا۔ جس سے بدن سڈول نہیں ہوتا۔ جس سے اعضا میں سختی اور جاذبیت نہیں پیدا ہوتی۔''

وہ انہی خیالات کی ندی میں بہتی گئی۔ اور رات کا لمحہ لمحہ بغیر کسی سرسراہٹ کے اُس کے کمرے کے باہر گزرتا گیا۔

(۲)

اُس وقت بھی جب کو مطلع ابر آلود تھا اور کشمیری عورتیں جھڑتے ہوئے پتے جمع کرنے میں منہمک تھیں۔ اُس کے ذہن میں کل کا واقعہ پھر رہا تھا۔ اُس نے آج صبح نوبت خان کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ اور نہ وہ اس کی طرف دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کبھی کبھی بے ساختہ طور پر باغ کی دوسری طرف پتوں پر جھکی ہوئی عورتوں کو دیکھتی تھی۔ کاش! وہ بھی خزاں کے موسم میں ٹوکری سر پر اُٹھائے باغوں میں پھرا کرتی۔ اور اپنے کوارٹر کی بلندی کے برابر پتوں کا ڈھیر جمع کر کے کبوتری کی طرح اُس پر لوٹتی۔ لیکن وہ بابا کی دایہ تھی۔ اور بابا گاڑی میں اونی رومال کے نیچے سو گیا تھا۔ وہ اس وقت واپس بھی نہ جا سکتی تھی۔ قدرت نے جہاں اسے اپنے وطن سے دور پھینکا تھا۔ وہاں اُس پر بھاری ظلم بھی کیا تھا۔ حُسن کو حُسن کا تابع بنا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ حسن کے اصطلاحی معنی سے غیر واقف تھی۔ اُس پر یہی سوچتے سوچتے کیفیت سی طاری ہو گئی۔ وہ اب بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ اسے انگور کی بیل کی طرح سہارے کی

ضرورت محسوس ہوئی۔ جس پر وہ اپنے بدن کا، اپنی اُمنگوں کا سارا بوجھ ڈال کر ملیامیٹ ہو جائے۔ اور زندگی کے مختلف دوروں سے گذرتے ہوئے اسے مطلق کوئی کوفت محسوس نہ ہو۔ لیکن سرینگر پردیس تھا۔ اور سہارا ابھی اُس کی نظروں سے اوجھل...... ابھی اُس کے تصور سے بھی باہر!

اور سامنے کشمیری عورتیں پتے جمع کرتی کرتی اُس کے نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ وہ بات بات پر مسکرا رہی تھیں۔ دوپہر سے کام کرتے کرتے وہ تھک نہ گئی تھیں۔ پُرانے کپڑوں میں بجھا ہوا شباب اور اُس پر گھربار کی بے پناہ محبت نے اُنہیں کس قدر مطمئن بنا رکھا تھا۔ پھٹے ہوئے پاؤں اور پیٹ تک لٹکتی ہوئی چھاتیاں اگرچہ اُن کی کم خوارکی اور پست مالی کا ثبوت تھیں۔ لیکن ان کی نگاہوں میں شعریت کا خمار اور قناعت کی جھلک تھی۔ اور ان کے برعکس نصرین کا بدن جو شوربہ پی پی کر گٹھا ہوا تھا۔ چُست اعضاء دلکش خدوخال، صاف اور ستھری پوشاک۔ لیکن پھر بھی غیر مطمئن...... سکون سے نابلد!

''اچھی ہو؟'' ایک عورت نے اپنا جھاڑو زمین پر پھینکتے ہوئے نصرین سے پوچھا۔

نصرین کا خیالی خواب ٹوٹ گیا۔ وہ چونک سی اُٹھی۔ بولی۔ ''شکر ہے۔''

دوسری عورت اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی...... ''تم آج اُداس کیوں ہو؟'' اُس نے مُسکرا کر نصرین سے پوچھا۔ ''مالک تو یاد نہیں آ گیا ہے؟''

نصرین چنار کے ایک پتے کو مروڑنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

تیسری عورت عمر میں ان دونوں سے ذرا بڑی تھی۔ وہ ہٹ کر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئی۔

''تمہارا مرد کیا ہے؟'' پہلی عورت نے دوبارہ پوچھا۔ نصرین یہ سوال سننا ہی نہ چاہتی تھی۔ اسی سوال نے اُسے کل دوپہر سے ذہنی تکلیف دی تھی۔ اور اب تک یہی بات اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ وُہ اِس سوال کو ٹالنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس سے کچھ بن نہ پڑا۔ مجبور ہو کر بولی۔ ''میں ابھی کنواری ہوں۔''

دونوں نوجوان عورتوں نے ایک دوسری کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ اُن کے خیال میں نصرین کی عمر چار پانچ بچوں کی ماں بننے کی عمر تھی۔

اُن میں سے ایک عورت نے نہایت رازدارانہ طریقہ سے پوچھا۔ ''تمہارے دل میں کبھی بھی شادی کی خواہش نہیں ہوئی۔''

نصرین نے سر سے نفی کا اشارہ کیا۔ لیکن خواہش کے لفظ کو وہ سمجھ نہ سکی۔ یہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کب پیدا ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا اُس کی فہم وفراست سے بالا تھا۔

نصرین نے پوچھا۔ ''تم سب نے شادی کی ہے؟''

اُن میں سے ایک نے جو جھاڑو سے بھی کھیل رہی تھی۔ اور نصرین کے خدوخال کو بھی غور سے دیکھ رہی تھی۔ مُسکرا کر جواب دیا۔ ''اوہو...... اب تک ماں باپ کے گھروں میں پڑی رہتیں؟ چشم بد دور ہم تو کئی بچوں کی مائیں بھی بن گئی ہیں اور......اور......''

''اری...... اُٹھو بھی...... بچے بلک رہے ہوں گے۔'' تیسری عورت نے جواب تک کمر سیدھی کر رہی تھی، دونوں نوجوان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

نصرین بھی اُن کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ دراصل اب لوٹنے کا وقت آپہنچا تھا۔

''تم اپنے بچوں کو کلم نہیں کھلاتی!'' نصرین نے پُوچھا۔

''کلم کیا؟''

''دودھ کا سفوف!''

☆☆☆

سچی پرارتھنا

لالہ دُرگا داس کو فوت ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ وہ اتنی حیثیت کا مالک نہ تھا کہ اس کا چار سالہ بچہ اور نوجوان بیوی اس پر زیادہ دیر گزارہ کر سکتے۔ بیچاری لجاوتی جس کے کئی رشتہ دار آسودہ حال تھے، مگر اس وقت کوئی بھی مددگار نہ تھا۔ اپنی زندگی اور اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا خیال کر کے اکثر رویا کرتی۔ کبھی دل میں ٹھان لیتی کہ اپنے بھائیوں کے پاس جاؤں یا کسی رشتہ دار سے مدد طلب کروں۔ کسی کے آگے ہاتھ دراز کرنا اس کی غیرت اجازت نہ دیتی۔ اس کے خاوند کا سرمایہ، جو سرکار کی طرف سے اس کے فوت ہونے کے بعد ملا تھا......اب ختم ہونے لگا تھا۔ اسے تمام دنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف سے ناامیدی ہی ناامیدی دکھائی دیتی تھی۔ جائداد منقولہ و غیر منقولہ بھی اس قدر نہ تھی کہ اس کو فروخت کر کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ سکتی۔ اس نے اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچے کے معصوم چہرے پر نگاہ پڑتے ہی لجاوتی کو دو سال پیشتر کا زمانہ یاد آیا۔ آہ وہ بچہ بھی ایشور سے رشوت دے کر لیا تھا۔ اب روٹی کیلئے ترستا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو برسنے لگے۔ اس نے پرائیویٹ نوکری کیلئے بہت تلاش کی۔ سینکڑوں گھروں میں روز جاتی اور شام کو پھر اپنے بچے سمیت گھر واپس آ جاتی۔ مگر ہر طرف سے کورا جواب ملتا۔ آخر بڑی کوششوں سے ایک جو فروش کی دکان پر دانے صاف کرنے پر ایک جگہ مل گئی۔ اب

لجاوتی جو کبھی شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی۔ ایک بھکاری کی طرح صبح گھر سے نکلتی اور آفتاب کے غروب ہونے کے بعد کچھ ٹکے لیکر واپس آتی۔ آہ وہ بھی وقت تھا، جب اس کے ہاں کئی سادھو سنیاسی اور حاجت مند لوگ فیض یاب ہوتے تھے۔ لیکن گردش فلک نے یہ حال کر دیا کہ وہ خود اوروں کے دروازوں پر روٹی کو ترسی ہے۔ دکان پر وہ اپنے بچے کو بھی ساتھ لیتی۔ بچہ دن بھر بازار میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتا۔ ماں اپنے خون پسینہ کو اناج صاف کرنے میں بہاتی۔ اس کی مستقبل کی تمام امیدیں ننھے کرشن کی ہستی سے وابستہ تھیں۔ وہ اتنی محنت اور ایسی مصیبت پر کم ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ بخوبی سمجھتی تھی کہ دنیا میں رنج و راحت ایک گول پہیے کی طرح پھرتے ہیں۔ جن کا سایہ ہر شخص پر یکساں اپنے اپنے وقت پر پڑتا ہے۔

دیپ مالا کا دن ...... ہر طرف سے چہل پہل تھی۔ حلوائیوں، آتش بازوں اور تصویر فروشوں کی دکانیں عروسِ نو کی طرح بنی ٹھنی ہوئی تھیں، ہر شخص خوش خرم دکھائی دیتا تھا۔ غریب لجاوتی آج بھی حسب معمول اپنی دکاں پر چلی گئی۔ دیپ مالا کی رونق اور شہروں کی سجاوٹ دیکھ کر اس شیشۂ دل پر ٹھیس لگی، اس کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلا۔ آہ یہ وہی دیپ مالا ہے جو میں بھی کبھی اپنے پتی کی موجودگی میں بڑی شردھا اور خوشی سے مناتی تھی۔ آہ آج میں بشاش ہوتی تھی۔ میرا گھر آج شام کے وقت چراغوں کی روشنی سے کیسا بقعہ نور بنا ہوتا تھا۔ آہ آج بھی دن ہے اور وہی میں ہوں۔ صرف قسمت کا پھیر ہے لکشمی دیوی تیری بڑائی کو میں نمسکار کرتی ہوں۔

شام ہوئی۔ لجاوتی کو سیٹھ صاحب کی بیوی نے بلایا۔ وہ ننھے کرشن کو لے کر چلی گئی۔ سیٹھانی نے پوجا پاٹ کر کے کچھ میٹھائی اور پیسے لجاوتی اور کرشن کو دے دیئے۔ لجاوتی نے نہایت عاجزی سے یہ لے لئے اور گھر کو روانہ ہوئی۔

بازار کی دھوم دھام دیکھ کر کرشن حیران ہوا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ آج کا دن کس

لئے اتنی شان سے منایا جارہا ہے۔ بازاروں میں غیر معمولی بھیڑ بھاڑ، سجاوٹ اور آراستگی دیکھ کراس نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''اماں جان۔ آج اس وقت یہ لوگ کدھر جارہے ہے۔ انہوں نے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھو۔ دکانوں پر کیسی مٹھائیاں بکتی ہیں۔ وہ بچے کس طرح مٹھائی خریدتے ہیں۔ کوئی موم بتیاں خریدتا ہے۔ کوئی پٹاخے لیتا ہے۔ کوئی آتش بازی کا سامان لیتا ہے۔ اماں مجھے بھی پیسے دو۔ میں بھی انہی کی طرح مٹھائی، پٹاخے اور موم بتیاں خریدوں۔ دیکھو میرے کپڑے کتنے میلے ہیں۔ تم نے مجھے بھی کیوں نئے کپڑے نہیں پہنائے''۔

کرشن کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ لجاوتی کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ گئی۔ اس کے پرانے زخموں پر نمک پاشی ہوگئی۔ اس کا دل گو کہ مصیبت آموز تھا مگر بچے کے الفاظ اور خواہشات، جن کیلئے وہ کسی زمانے میں روپیہ پانی کی طرح بہاتی تھی، سن کر تاب نہ لا سکی۔ وہ ہچک ہچک کر رونے لگی۔ اپنے دل کو ذرا تقویت دے کراس نے کرشن کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بوسہ لیکر کہا۔

''میری آنکھوں کے تارے آج دیپ مالا کا دن ہے آج لکشمی جی کی پوجا کرتے ہیں۔ دیوی مٹھائیوں، پٹاخوں، اور موم بتیوں سے خوش نہیں ہوتی۔ وہ صرف پرارتھنا سے خوش ہوتی ہے۔ ہم بھی گھر پہنچ جائینگے۔ تو وہاں لکشمی جی کی پوجا کریں گے۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ کے گھر سے جو بتاسے ملے ہیں۔ ہم ان کو دیوی پر بھینٹ چڑھائیں گے۔ وہ سب سے زیادہ ہم سے خوش ہوگی''

بچوں کا دل کسی دلچسپ چیز اور خصوصاً کھیلنے والی چیزوں پر آتا ہے تو وہ کب اپنے ماؤں کے ایسے حیلے بہانے سننے کو تیار ہوتے ہیں۔ بلکہ ایسے حیلوں سے ان کی ضد اور بھی زور پکڑ جاتی ہے

کرشن کو نہ ماننا تھا، نہ مانا۔ وہ اپنی ضد پر بدستور اڑا رہا۔ اور سر بازار اتنا رویا کہ اس کی سسکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ اسے کیا علم تھا کہ میری ماں تنگ دست اور پیسے پیسے کی محتاج ہے، وہ مجھے کھلونا دینے کے قابل نہیں ہے۔

بچے کا یہ حال دیکھ کر ماں نے بہت ضبط کیا لیکن ماں کے آنسو بھی نہ رکے۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے آنے اور جانے والوں کی طرف دیکھتی۔ اس کی آنکھیں بذات خود اسکی محتاجی کی ترجمان تھیں۔ اس نے اپنی پھٹی ساڑی سے سیٹھ جی کے پیسے نکالے اور بچے کو دیکھ کر کہا ''یہ لو پیسے۔ آؤ تم کو پتاسے اور موم بتیاں خرید کر دیتی ہوں'' پیسے کی صورت دیکھ کر کرشن چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر مسرت آگئی۔ ماں نے اس کو ہاتھ سے پکڑا اور ایک دکان سے موم بتیاں اور پتاسے خرید کر گھر روانہ ہوگئے۔ کرشن کو خوش دیکھ کر اس کا دل بھی مسرت کے جزبے سے لبریز ہوگیا۔

گھر پہنچ کر کرشن نے لکشمی کی تصویر جو ایک کمرے میں آویزاں تھی، اتروادی اور مٹھائی پتاسے اس کے آگے رکھ کر موم بتی روشن کی۔ ماں کی ہدایت کہ لکشمی جی صرف پرارتھنا سے خوش ہوتی ہیں۔ اس کے دل پر نقش ہوگئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے بھولے بھالے الفاظ میں دیوی کی پرارتھنا کی۔ اور جو پرارتھنا ماں نے راستے میں اس کو سکھائی تھی، لفظ بہ لفظ پڑھی۔ آنکھیں کھولی اس کے چہرے پر ایک نورانی چمک تھی۔ اس کا دل بشاش تھا۔ اس کے ضمیر کو تسکین حاصل ہو چکی تھی۔ گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیوی اس کی پرارتھنا سے پرسن ہوئی ہے۔

دن گزر گئے۔ مہینے گزر گئے۔ اور مہینوں سے سال گزر گئے۔ کرشن کو کو بھی پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھایا گیا تھا۔ اگر چہ وہ غریب تھا مگر اس کی تقدیر غریب نہ تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی خفیہ تقدیر کسی نہ کسی دن بیدار ہوگی۔ اور یہ غریب بچہ جو آج روٹیوں کو ترستا ہے۔ کسی دن سورج کی طرح اپنے علم و ہنر سے دنیا کو منور کر دے گا۔

امسال اس نے انٹرنس کا امتحان دے دیا اور یونیورسٹی میں اول نمبر پر رہا۔ ایسی شاندار کامیابی پر یونیورسٹی نے کرشن کیلئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ کرشن کی بھی خواہش تھی کہ کالج میں داخلہ ہو۔ وظیفہ مقرر ہو جانے سے اس کی خواہش مستحکم ہوگئی۔ وہ کالج میں داخل ہوا۔ اور اسکول کی طرح اس نے کالج میں بھی بہترین کامیابی حاصل کی۔ کوشش کر کے وہ کئی طلباء کا پرائیوٹ اتالیق مقرر ہو گیا۔ اور وہاں سے بھی کافی معاوضہ ملتا رہا۔ ماں کو خرچہ دینے کے علاوہ وہ خود بھی اچھی طرح گزارہ کرتا رہا۔

گو وہ ابھی آرام کی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کچھ سال قبل جیسی حالت بھی نہ تھی۔ اس کی ماں نے جو فروش سیٹھ کی نوکری ترک کر دی۔ وہ کرشن کے وظیفہ پر ہی گزارہ کرتی رہی۔ کرشن نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی۔

ایم اے کے امتحان میں بھی وہ حسب معمول اول رہا۔ یونیورسٹی نے اس قابل ہونہار نوجوان کو گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی آسامی پر مقرر کیا۔

کرشن کمار کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے شہر سے دور ایک عمدہ ہوادار بنگلہ کرایہ پر لے لیا تھا۔ نانی کی گود میں دو ننھے بچے بھی کھیل رہے تھے۔ لجاوتی اپنے بیٹے کرشن کمار کے نونہالوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔ وہ صبح اپنی موٹر کار میں ماں، بیوی اور بچوں کو سیر و تفریح کیلئے باہر لے جایا کرتا اور واپسی پر کالج چلا جاتا۔ دو بجے کے قریب کالج سے

واپس آکر مطالعہ کتب میں مصروف رہتا۔ اس کو اپنی گزشتہ زندگی پیش نظر تھی۔ وہ ہر وقت ایشور کی یاد میں مگن رہتا۔ اس کی طبیعت عاجز اور سلیم تھی۔

لجاوتی اس آرام دہ زندگی کا باعث وہی دیپ مالا اور کرشن کی سچی پرارتھنا سمجھتی۔ اس نے آج تک کرشن کمار کو یہ راز نہیں بتایا تھا۔ اب ان کے کئی رشتہ دار پردہ غیب سے ظہور میں آئے۔ مگر لجاوتی نے ان سے کبھی اپنی غربت میں مدد نہ کرنے کی شکایت نہیں کی۔ اسے علم تھا، مصیبت اور غربتکے وقت قریبی رشتہ دار بھی مدد کرنے سے دریغ کرتے ہیں اور ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا وہ ان کے رشتہ دار ہی نہیں۔

آج دیپ مالا کی چھٹی تھی۔ پروفیسر کرشن کمار دن بھر شام کی پوجا کیلئے سامگری منگوانے میں مصروف رہا۔ اس کو اس دن کی اتنی برکت کا علم نہ تھا۔ جونہی شام ہوگئی، ہر طرف دیپ جلائے گئے۔ بنگلہ بجلی کے لیمپوں سے جگمگا اٹھا۔ پروفیسر صاحب اپنے پروہت جی کے ساتھ پوجا والے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اس کے ساتھ ہی لجاوتی اور اس کی بہو، بچے بھی داخل ہوئے۔ پروہت جی زور زور سے پرارتھنا کرنے لگے۔ اور پروفیسر بڑی بھگتی سے لکشمی جی کی نقرئی مورتی پر پشپ چڑھاتے رہے۔ یکایک پیچھے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ کرشن کمار نے دیکھا تو اس کی ماں رو رہی تھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے تعجب آمیز نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور سبب پوچھا کہ ایسے وقت جب سب لوگ خوشیاں منانے میں مصروف ہیں، تم کیوں رو رہی ہو۔ ماں کی آنکھوں سے اور بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ آہ میرے بیٹے۔ یہ وہی دیپ مالا ہے۔ جس نے مجھے ایک رات زار زار رلایا تھا اور وہی دیپ مالا جس نے تمہاری سچی پرارتھنا کے اثر سے آج یہ خوش نصیب دن دکھایا ہے۔

☆☆☆

محقق کی دوسری کتاب

کلیاتِ پریم ناتھ پردیسی

(ریاست کے پہلے افسانہ نگار کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تحریریوں کا خزینہ)

مدون و مرتب

ڈاکٹر محمد افضل میر

PREM NATH PARDESI
Aks Dar Aks

"پریم ناتھ پردیسی...... عکس درعکس" ڈاکٹر محمد افضل میر کا تازہ ترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ انہوں نے پریم ناتھ پردیسی کے تعلق سے جو ادبی فریضہ انجام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے بھرپور اور قابل ستائش ہے۔ اس میں ان کا اپنا انداز اور اسلوب نظر آتا ہے۔ آنجہانی پریم ناتھ پردیسی پر بہت سارے تخلیقی اور تنقیدی مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن ڈاکٹر میر کی یہ تحقیق ہمارے عظیم افسانہ نگار کی زندگی، ان کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک جامع دستاویز ہے۔ ڈاکٹر میر نے پریم ناتھ پردیسی کی شاعری، ڈرامہ نگاری، اور افسانہ نگاری کے رنگوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ کینواس پر بکھیر کر ایک خوبصورت کولاژ پیش کیا ہے۔ اس کولاژ میں ایک بڑی ادبی دنیا سمائی ہوئی ہے۔ مجھے مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر میر نے اس دنیا کو اپنی نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنے قلم سے پرکھا ہے۔ میں ڈاکٹر محمد افضل میر کو ان کی اولین تنقیدی اور تحقیقی کتاب پر مبارکبادی پیش کرتا ہوں......

نور شاہ
سرینگر



Dr Muhammad Afzal Mir

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com


978-93-86624-30-7